نظریاتِ اقبالؒ

محمد بشیر رانجھا

تاریخ طباعت:۔ اگست ۲۰۰۲ء

نام کتاب: نظریاتِ اقبالؒ

تالیف: محمد بشیر رانجھا

ضخامت: ۱۰۰ صفحات

قیمت: ۸۰ روپے

ناشر

فرینڈز پبلشرز

راولپنڈی

انتساب

پیارے والدین کے نام

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش

گرچہ سر نہ تراشد ، قلندری داند

فہرست

پہلا قدم

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش
گرچہ سر نہ تراشد ، قلندری داند

ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی لکھتے ہیں:۔

"اقبال کو قدرت نے پیغمبرانہ دل، فلسفی دماغ قلندرانہ مزاج اور شاعرانہ تخیل کی دولت سے سرفراز کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مشرق کی روح کو بازیافت کیا اور اسے عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ۔ اقبال کے فلسفے کی مشرقیت نے ہمیں مغرب کو سمجھنا اور اس کے ضروری عناصر کو قبول کرنا سکھایا۔ داغ سے رومی تک پہنچنے میں اقبال نے ایک طویل علمی اور فکری سفر طے کیا۔ انہوں نے یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی مگر دانش فرنگ ان کی نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکی۔ وہ تشکیک کے کانٹے لے کر یورپ گئے تھے مگر مومن کا دل لے کر یورپ سے واپس لوٹے۔ بلکہ خود انہی کے الفاظ میں "یورپ نے ان کو صحیح معنوں میں مسلمان کر دیا"۔............ اقبال نے جہاں مشرق کے علمی خزانوں سے روشنی حاصل کی اور ابن مسکویہ، فارابی، غزالی، رازی، رومی، حافظ، ابن عربی، عطار، سنائی اور دیگر مسلم مفکرین کے مطالعے سے فکر کے آبدار موتی جمع کیے وہاں انہوں نے مغرب میں افلاطون، ارسطو، کارل مارکس، ہیگل، لینن، دانتے، نطشے، گوئٹے، شوپنہار، ملٹن، اور برگساں کا گہرا مطالعہ کیا۔ مغربی تمدن اور معاشرہ کی تحصیل مغرب میں رہ کر ہی کی۔ اس طرح اقبال نے عرب و عجم، ہندو یونان، روما و افغان اور مشرق و مغرب کے علوم سے استفادہ کیا ان پر اقبال کی گہری نظر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کا علم محض سماعی اور قیاسی نہیں بلکہ عینی مشاہدات پر بھی مبنی ہے۔"[1]

اس اقتباس کے مطالعہ کے بعد ایک عام قاری کو بھی اس بات کا اندازہ کرنے میں یقیناً دشواری نہ ہوگی کہ اقبال کے فکر و فلسفہ اور علمی نظریات کی اساس اور بنیاد ایسے خطوط پر استوار ہے کہ جن کا احاطہ کرنے کے لئے اور جن پر بحث کے واسطے علم تاریخ و ادبیات سے گہری واقفیت اور شناسائی از حد ضروری ہے۔ علامہ اقبال کے علمی نظریات کی بنیادیں ایسے مضبوط اور پائیدار خطوط پر استوار ہیں کہ جن تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ اسلامی ادبیات، تاریخ اور معاشرتی علوم کی طرف لازماً رجوع کرنا پڑے گا۔ پھر بھی یہ امکان ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے فکر و فلسفے کی اصل روح تک نہ پہنچ سکیں۔ کوئی فرد واحد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اقبال کے فکر، فلسفے اور اس کے حقیقی مفہوم کا ادراک کر سکا ہوں۔

راقم الحروف نے اقبال کے فکر و فلسفہ سے خوشہ چینی کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس دوران متعدد کتب زیر مطالعہ رہیں۔ جن میں سے ایک کثیر تعداد ان کتب کی ہے جو اقبال کے افکار و نظریات کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہیں۔ اقبال کے فلسفیانہ اور شاعرانہ نظریات سے قطع نظر میرے سامنے ان کے صوفیانہ نظریات تھے۔

اقبال شناسی کی کٹھن منزل کی طرف اٹھنے والا یہ میرا پہلا قدم ہے۔ مجھے اپنی کوتاہ علمی کا بھرپور احساس ہے اور یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ میں اقبال کے نظریات کے تعین اور تلاش میں کامیاب ہو گیا ہوں تاہم ایک بات کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ میں نے اس معمولی ضخامت کی کتاب میں بہت کچھ سمونے اور سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اہل علم حضرات سے گذارش ہے کہ میری اس جسارت میں اگر کسی جگہ کوئی علمی یا فنی فرو گذاشت پائیں تو میری رہنمائی ضرور فرمائیں۔

محمد بشیر رانجھا

راولپنڈی کینٹ

ماہِ نو.........لاہور (نومبر ۱۹۸۸ء) ص ۴

باب اول

اقبالؒ کا نظریہ توحید

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

دنیا میں آج تک جتنے بھی مذاہب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے ان سب کا بنیادی اور واحد مقصد یہی تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ خالق کون و مکان کے وجود حقیقی کے ادراک کی قوت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ واحد لاشریک کے سوا ہر قسم کی طاغوتی اور استبدادی طاقتوں کی غلامی سے نجات پا جائے۔ تمام الہامی ادیان فطرت کی طرح قرآن کریم نے بھی توحید خالص پر ایمان و یقین اور احکامات الٰہی کی مکمل پاسداری پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ یہی وہ مرکزی عقیدہ ہے جو غیر اللہ کی غلامی اور خوف سے نجات کا واحد ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ توحید باری تعالیٰ ہی ایسا مسئلہ جسے سمجھانے کیلئے تمام انبیائے کرام علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطغوت

(ترجمہ: ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا۔ اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔)

اللہ تعالیٰ نے اسی دعوت کو عام کرنے کے لئے کتب اور صحیفے نازل فرمائے۔ اور سب سے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر اپنی آخری کتاب قرآن کریم نازل فرمائی۔ جس کا مقصد وحید بھی یہی تھا کہ دعوتِ توحید کو پھیلایا اور عام کیا جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

هذا بلاغ للناس ولينذروا به وليعلموا انما هوا لہ واحدو ليذكر الوا الالبٰب

(ترجمہ:یہ ایک ایسا پیغام ہے، سب انسانوں کے لئے اور بھیجا گیا ہے اس لئے کہ ان کو اس کے ذریعہ سے خبردار کردیا جائے ،اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں بس خدا ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آئیں)۔

ارشاد ربانی ہے:۔

الف: والھکم الہ واحد۔۔۔

(ترجمہ: اور اللہ تمہارا ایک ہی معبود ہے)

ب: اللہ لا الہ الا ھو۔۔۔۔۔

(ترجمہ:اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں)

ج: الا تدع مع اللہ الھا اخر لا الا ھو قف۔۔۔

(ترجمہ:اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو،اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں)

قرآن حکیم میں تقریباً ہر آیت سے صراحتاً یا کنایۃً توحید کا ہی اثبات ہے۔کیونکہ قرآن پاک کے نزول کی بنیادی وجہ ہی توحید کی تبلیغ اور اللہ تعالیٰ کے واحد لاشریک ہونے کی گواہی دینا ہی تھا۔ اور قرآن کی تعلیمات کا نچوڑ اور ما حاصل ہی نظریہ توحید کا اثبات ہے۔اللہ رب العزت فرماتے ہیں:۔

الکتب احکمت ایٰت ثم فصلت من لان حکیم خبیر الا تعبدوالا اللہ طانن لکم منہ نذیر و بشیر ۔

(ترجمہ:یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں ۔ایک دان اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم بندگی کرو،مگر صرف اللہ کی، میں (رسول پاک ﷺ) اس کی طرف سے خبردار

کرنیوالا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔)

انبیائے کرام علیہ السلام کو جو بڑی بڑی تکالیف اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اس کا سبب بھی یہی دعوت توحید تھی۔ اور یہی سلوک رسول اکرم ﷺ کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اور رسول اکرم ﷺ کو مخالفین کی طرف سے کئی قسم کی تکالیف اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ کم وبیش نو برس میں ۲۷ لڑائیوں میں آنحضرت ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے۔ بدر، حنین، احد اور تبوک وغیرہ معرکے توحید الٰہی کے قیام کے لئے ہوئے۔ مکی دور میں مشرکین کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو بہت سی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں، مثلاً بدزبانی، استہزاء، مارپیٹ اور ترک موالات، پھر شعب ابی طالب میں مقید زندگی گزارنا اور آخرکار مجبور ہوکر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کرنا پڑی۔ آپ ﷺ نے ہجرت کے وقت مکہ معظمہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

واللہ انک لخیر ارض اللہ واحب ارض اللہ الی اللہ ولالانی اخرجت منک ما...... (ترجمہ: بخدا تو اللہ کی بہترین سرزمین ہے، اور اللہ کی ہر سو پھیلی ہوئی تمام زمین میں سے اس کی محبوب ترین زمین ہے۔ اگر مجھے تجھ سے نکال نہ دیا جاتا تو بالکل نہ نکلتا)

ان سب تکلیفوں کی محرک اول دعوت توحید تھی۔ اور جب کبھی آپ ﷺ نے کوئی مبلغ روانہ فرمایا تو اس کو بھی اس سلسلہ کی طرف دعوت دینے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کی طرف بھیجتے وقت آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

اول ما تدعوھم الیہ یوحدوا اللہ (بخاری)

(ترجمہ: تم ان سب کو پہلی دعوت یہ دو کہ وہ اللہ کی توحید کا اقرار کریں)

توحید کی دو قسمیں ہیں:۔

الف: توحید معرفت واثبات: یہ توحید ربوبیت و اسماء و صفات ہے۔

ب: توحید طلب و قصد: یہ توحید الوہیت و عبادت سے موسوم ہے۔

توحید کی پہلی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کے افعال، اور اس کے اسماء کی حقیقت کا اثبات، اپنی کتب کے ذریعے اس کا تکلم، اپنے بندوں میں سے جس سے چاہے اس کی تکلیم، اس کی قضا و قدر اور حکمت کا اثبات عموی۔ قرآن نے توحید کی اس نوع کو نہایت وضاحت سے بیان فرمایا ہے، مثلاً:۔

- سورۃ الحدید کے آغاز میں۔
- سورۃ طٰہٰ میں۔
- سورۃ الحشر کے آخر میں۔
- سورۃ تنزیل السجدہ کے شروع میں۔
- سورۃ آل عمران کی ابتدائی آیات۔
- اور پوری سورۃ اخلاص۔

توحید کی دوسری قسم یعنی توحید الوہیت اور توحید عبادت کا حکم قرآن مجید میں مندرجہ ذیل مقامات پر نہایت وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:۔

- سورۃ الکافرون۔
- سورۃ آل عمران (آیت ۶۴)۔
- سورۃ زمر کی ابتدائی اور آخری آیات۔
- سورۃ المومن کی ابتدائی، درمیانی اور آخری آیات۔
- سورۃ اعراف کا شروع اور آخری حصہ۔
- سورۃ انعام پوری۔

قرآن پاک کہتا ہے کہ خدا حسن و خوبی کی ان صفات سے جو انسانی فکر میں سما سکتی ہیں متصف ہے، وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے والا ہے، سننے والا ہے،

سب کچھ دیکھنے والا ہے،اور سب کچھ جاننے والا ہے۔لیکن یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں۔جو تمہارے تصور میں آسکتی ہو۔وہ عدیم المثال ہے۔تمہاری نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔یہی توحیدِ خالص ہے۔

عربی لغت میں اس سے مراد یکتائی، وحدت،اور علم الکلام کی اصطلاح میں خدا تعالیٰ کی ذات کا ہر طرح کے شرک اور دوئی سے پاک ہونا ہے۔اسلام کے بنیادی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ یہی ہے۔قدیم مذاہب میں بھی حیرت انگیز طور پر توحید کا تصور ضرور ملتا ہے۔قرآنِ پاک نے جہاں توحید کی تعلیم دی ہے اور اللہ واحد لاشریک کو عبادت کے لائق ماننے پر اصرار کیا ہے۔وہاں واضح دلائل بھی پیش کیے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں واحد اور لاشریک کیسے ہے۔اور اس کی واحدانیت کی واضح نشانیاں کیا کیا ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ا۔ لو کان فیهما الهته الا الله لفسدتا

(اگر (زمین اور آسمان میں) خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو (زمین اور آسمان، دونوں کبھی کے) برباد ہو گئے ہوتے)۔

ب۔ وما کان معه من اله اذاً لذهب کل اله بما خلق ولعلا بعضهم علیٰ بعض.

(اور اس کے ساتھ اور کوئی خدا نہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہر ایک خدا اپنی مخلوقات کو (الگ) لئے پھرتا اور آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے پر غالب آجاتا)

شرک کی مذمت میں قرآنِ پاک نے واضح اور دوٹوک احکامات پیش کیے ہیں اور شرک کو ناقابلِ معافی گناہ، ظلمِ عظیم، گمراہی اور فساد وغیرہ کے الفاظ میں پیش کیا ہے۔کیونکہ اللہ تو ایک ہی ہے اور اس کی حکومت وحاکمیت میں کسی اور کو شریک کرنے سے تمام انسانیت کی بنیادیں کھوکھلی اور تمام کارخانۂ وجود کی ترتیب درہم برہم ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کا یہ واضح اعلان اور حکم ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے

بخش دیتا ہے لیکن شرک کو کبھی معاف نہیں کرتا قرآنِ پاک میں ہے کہ:

ان اللہ لا یغفر یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء

(بے شک اللہ تعالیٰ اس شخص کی مغفرت نہیں کرتا جو اس کے ساتھ شرک کرے اور اس کے سوا جس کو (اللہ تعالیٰ) چاہتا ہے بخش دیتا ہے)

رسولِ اکرم ﷺ نے توحید کو تمام نیکیوں پر فضیلت دی ہے۔ اور فرمایا کہ جس طرح انسانی بدن میں دل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح عقیدۂ توحید کو اسلام میں مرکزی حیثیت اور مقام حاصل ہے۔ اگر توحید پر کامل ایمان ہے تو تمام دوسری نیکیاں بھی درست اور قابلِ قبول اور اگر اس عقیدہ میں کمزوری ہے تو دوسرے تمام اعمال بھی کمزور ہیں۔

شرک کے رد میں صرف یہی کافی نہیں ہے کہ موجودہ نام نہاد ترقی یافتہ دور میں، جبکہ سائنسی ترقی اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہی ہے اور ہر شعبہ حیات میں نت نئے انقلابات کی خبریں منظرِ عام آ رہی ہیں، لیکن اتنی مادی، ذہنی، فکری، فنی اور تکنیکی ترقی کے باوجود سائنس، درخت کا ایک پتا، گلاب کی ایک پنکھڑی، اور پرندے کا ایک پر بھی بنانے سے قاصر ہے۔ بلکہ ایسا کرنا اس (سائنس) کے لئے ناممکن ہے۔ آج سے صدیوں پہلے قرآنِ پاک نے عالمِ کفر کو ایک چیلنج دیا تھا، جو آج تک برقرار ہے اور تا ابد برقرار رہے گا کہ:-

ان الذین تدعون من دون اللہ من یخلقوا ذباباً و لوا جتمعوا لہ۔

(خدا کے سوا جن معبودوں کی تم پکارتے ہو، ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ اس کے (پیدا کرنے کے) لئے سب اکٹھے ہوں نہ ہو جائیں)

اس لئے خداوند تعالیٰ نے انسان کو عقلِ سلیم اور بصیرت عطا فرمائی تاکہ سچ اور جھوٹ کو عقلِ سلیم کی کسوٹی پر پرکھ سکے۔ اسے اس بات کی تمیز اور شعور بخشا کہ وہ اپنے خالق و مالک، رازق و رزاق اور کائنات کی جملہ اشیاء کے حقیقی کارساز کی واحدانیت کا ادراک کر سکے۔ ورنہ اس کی ہستی، اس کا وجود، اور

اس کی ذات ایک بے معنی اور بے مصرف سی چیز ہو کر رہ جائے گی۔

اس فیصلہ کی وجہ جواز بالکل عیاں اور واضح ہے کیونکہ جب خدا کے احکامات کی پیروی سے انسان پہلو تہی یا روگردانی کرتا ہے تو اس کے ذہن و فکر کی آزادی اور سر بلندی جاتی رہتی ہے۔ اور جہاں میں وہ انسان پرست ہو جاتا ہے۔ کہیں سطوتِ کسریٰ و قیصر کے سامنے جبہ سائی کرتا ہے تو کہیں کاہن و پاپا کی غلامی کا طوق اپنے گلے کی زینت بناتا ہے۔ کبھی سلطان و امیر کی پرستش کرتا ہے تو کبھی ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کی غرض سے ظلم و جبر کے سامنے گردن خم کر لیتا ہے۔ غرضیکہ جہاں انسانیت کی تذلیل کے اسباب پیدا ہوتے ہیں وہاں انسان کے شرفِ اشرف المخلوقات کی تذلیل ہوتی ہے۔ اور انسان اپنے وجود و ذات کی بھی انتہائی حقیار اور کمتر ثابت کرتا ہے کہ خدا کی غیرت جوش میں آ جاتی ہے اور وہ انسان پر سے اپنے دستِ رحمت و شفقت کو اٹھا لیتا ہے۔ اور اسے مصائب و مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور یہ سب مشکلات و مصائب انسان از خود مول لیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت کو یوں شعر کے پیرائے میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں:

بود انسان در جہاں انسان پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت
باج بر کشت خراب او نوشت

در کلیسا ابنِ مریم را بدار
مصطفیٰ را از حرم بیرون سپار

برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ

وہ انسان جو توحیدِ کامل کا قائل ہے اور اپنے آپ کو صرف ایک ہی اللہ کے در کا محتاج سمجھتا ہے، کسی دوسرے آئین کے سامنے نہیں جھکتا اور نہ ہی دنیاوی طاقت و جبروت قوت و استبداد اسے مرعوب کر سکتی ہے۔ اگر انسان اپنی بے بصری کی وجہ سے کسی اور انسان کی بندگی کرے تو اس خوئے غلامی کی بدولت وہ کتوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے، کیونکہ کتے جب لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کے سامنے اپنا سر خم نہیں کرتے۔ اور انسان اگر دوسرے انسان کے سامنے جھک جائے، چاہے کسی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو تو وہ خوئے غلامی اور انسان کی بندگی کی بدولت ان سے بھی گیا گزرا ہے۔ پیامِ مشرق میں اقبال فرماتے ہیں:

آدم از بے بصری بندگیِ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

قرآنی نظام کی رو سے ایک انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں ہے اور اسی وجہ سے وہ انسان جنہوں نے حدود سے تجاوز کیا اور سرکشی اختیار کی وہ سب واجب التعزیر ٹھہرے۔ توحید کا اثبات نفیٔ غیر ہے۔ توحید وہ نقطہ ہے جس کے گرد سارا عالم محوِ گردش ہے اور تمام عالمِ وجود اور کارخانۂ قدرت کی انتہا

اس کا اثبات واقرار ہے۔اقبال فرماتے ہیں:

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ
انتہائے کارِ عالم لا الٰہ

توحید صرف خدائی عبادت سے قائم نہیں بلکہ اس کے لئے طاغوت اور غیر اللہ کے بندھنوں اور جکڑ بندیوں سے آزادی حاصل کرنا بھی انتہائی ضروری ہے۔توحید جملہ اسرار کائنات کی گویا کنجی ہے۔اور اسی عقیدہ کی پختگی کا ثمرہ ہے کہ انسان کو طاغوت کے ظلم و جبر اور غلامی سے نجات ملتی ہے:

"لا" و "الٰہ" احتسابِ کائنات
"لا" و "الٰہ" فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہاں کاف و نون
حرکت از "لا" زاید از "الا" سکون
تا نہ رمزِ "لاالٰہ" آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

مومن "لاالٰہ" سے شروع ہو کر انجامِ کار "الا اللہ" کی منزل پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا اقرار کرتا ہے اور اللہ ربّ العزت کا محکوم بن کر کائنات کا مختار بن جاتا ہے۔اس غلامی میں سرداری ہے اور اس خدا شناسی میں فلاح و سعادت ہے۔علامہ اقبال فرماتے ہیں:

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست
ایں نخستیں منزلِ مردِ خدا است
لا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے
ایں شورِ عدا ست نے آوازِ نے

ضرب او ہر بود را سازد نبود
تا بروں آئی ز گرداب وجود
ہر اندر دست او شمشیر لاست
جملہ موجودات را فرماں رواست

یہ قوت افراد اور ملت دونوں کے لئے یکساں طور پر سودمند اور مفید ہوتی ہے۔ توحید دونوں کے لئے قوت وجبروت کا سرچشمہ ہے۔ اس سے افراد لاہوتی بنتے ہیں اور ملت میں قوت وجبروت اور طاقت واستقامت آتی ہے اور باہمی استحکام میں اضافہ ہوتا ہے۔ افراد اور ملت کی توانائیاں اور طاقتیں مجتمع ہو کر زندگی کو پیغامِ عمل دیتے اور ہر دم متحرک اور فعال رہنے میں بنیادی کردار کرتی ہیں۔ حوصلوں کو جلا ملتی ہے اور عزم نو کو توانائی اور قوتِ نمو کا وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔ جس سے لاہوتی قوت وطاقت کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے:

فرد از توحید لاہوتی شود
ملت از توحید جبروتی شود
ہر دو از توحید می گیرد کمال
زندگی ایں را جلال آں را جمال
ملتے چوں می شود توحید مست
قوت و جبروت می آید بدست

فطری طور پر انسان کو اپنے عزیز واقارب سے محبت ہوتی ہے اور یہ محبت بعض اوقات ایسی شدید صورت اختیار کر لیتی ہے کہ انسان دینی فرائض کی بجا آوری میں رکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ اور غفلت کا شکار رہتا ہے۔ لیکن کلمہ توحید پر ایمان لانے والے مردِ حق کا حال یہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی فطری جذبے کو احکاماتِ خداوندی پر ہرگز ہرگز ترجیح نہیں دیتا، بلکہ اس پر اللہ العالمین کی محبت اور اطاعت کا

جذبہ غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کو عین سعادت اور نجاتِ اخروی کا وسیلہ سمجھ کر کسی ذرہ برابر کوتاہی کا بھی مرتکب نہیں ہوتا۔علامہ اقبالؒ نے اسی خیال کو اسرار و رموز میں کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے:

ہر کہ در اقلیم "لا" آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ماسوائے قطعِ نظر
می نہد ساطور بر حلق پسر

اقبالؒ کی نظر میں خوفِ غیر شرک ہے اور خوفِ حق ایمان کا عنوان ہے۔ایمان کے مستحکم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ انسان خوفِ خداوندی کے ہوتے ہوئے کسی بھی شیطانی اور طاغوتی طاقت سے خوف زدہ نہ ہو اور غیر اللہ سے ہرگز خوف نہ کھائے، کیونکہ حق تعالیٰ نے بھی اسی کا حکم دیا ہے:

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس
خوفِ غیر از شرک پنہان است و بس

شیطانی قوتیں انسان کے دل میں خوف و حزن پیدا کر کے اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کی کوشش کرتی ہیں اور غیر کا خوف عمل کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔عمل اور ارادے کا دشمن یہی خوف ہے۔علامہ اقبالؒ اسی خوف سے چھٹکارا پانے کے لئے ایمانِ کامل اور توحید پر پختہ عقیدے کا نسخہ تجویز کرتے ہیں اور راہِ مصطفیٰ ﷺ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است
تخم او چوں در گلست خود را نشاند
زندگی از خود نمائی باز ماند

ہر کہ رمز مصطفیٰؐ فہمیدہ است

شرک را در خوف مضمر دیدہ است

عقیدۂ توحید، اسلام اور مسلمان ہر دو کا مرکز ہے۔ جس سے مسلمان کی زندگی کے تمام امور اور سب چھوٹے بڑے کام پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے توحید کے موضوع پر ایک مکمل نظم کہی وہ ضرب کلیم میں اقبال فرماتے ہیں:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی

آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم الکلام

روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو

خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے

قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا، نہ فقیہ

وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے

اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

یہ نظم ہمارے سامنے توحید کا وہ پہلو بیان کرتی ہے جس کی طرف بالعموم مسلمانوں کا ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ ہم توحید کو صرف ایک خیال کی حد تک مقید رکھتے ہیں۔ اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ عملی دنیا میں اس کی اہمیت اور وقعت کیا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جنہیں ہم بہت سادہ اور عملی میدان کے مقابلے میں بہت پیچھے سمجھتے ہیں، توحیدی فکر اور عمل کو ایک جان کر کے ان میں وہ ربط پیدا کیا کہ آج ہمارے سمیت پوری دنیا ان کے کارناموں پر انگشت بدنداں ہے۔ توحید انسانی سوچ کو ہر غیر خدا سے

پاک کر دیتی ہے۔اور یہ سوچ خدا کے سوا کسی بھی دوسرے کے دباؤ سے بے نیاز ہو کر دیا اور اس کے عملی پہلو سے منقی ہے۔اور خدا کامیابی کے راستے ان پر کھولتا چلا جاتا ہے۔توحید جوہر شے کی روح ہے وہ مردِ مومن کی فکر پر خود بخود یوں واضح ہوتی جاتی ہے کہ وہ از خود کوئی مسئلہ ہونے پر اس کا حل بھی سمجھاتی چلی جاتی ہے۔اس سلسلہ میں مردِ مومن کو توحید کا دلی احترام کرتے ہوئے اپنے ذرائع کو بروئے کار لا کر سچی لگن اور طلب سے کام کرنا ہوتا ہے۔توحید کے عملی پہلو کو سامنے رکھے بغیر کوئی مردِ مومن کامیابی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔احساسِ توحید انسان میں ان تمام صلاحیتوں کو بیدار اور سرگرمِ عمل کر دیتا ہے، جو اللہ نے انسان میں پیدا کی ہیں۔اور حقیقت یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کی کوئی انتہا نہیں۔دماغ کو ہی لے لیجیے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آج تک انسان زیادہ سے زیادہ اپنے دماغ کا پندرہ فیصد استعمال کر سکا ہے اور باقی دماغ انسان سے آج تک پنہاں ہے۔اسی طرح موت کا راز یا زندگی کی پُر اسراریت۔توحید کی طرف پہلا قدم مسلمان کا رزقِ حلال پر جینا ہے۔رزقِ حلال جو اپنی محنت سے کمایا گیا ہے اور رزقِ حرام سب سے بڑا شرک ہے۔لہٰذا یہ رزقِ حرام مسلمانوں کی مسلمانی کی حقیقی موت ہے۔اس توحید فہمی کے لئے توحید پر اترنا پڑتا ہے۔بلکہ توحید کا حصہ بننا پڑتا ہے جو بظاہر ناممکن دکھائی دیتا ہے۔مگر یہ کام انتہائی ضروری ہے۔اسی مقام پر پہنچ کر اقبالؒ فرماتے ہیں:

چوں میگویم مسلمانم، بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

توحید کے باب میں اقبالؒ "ہمہ اوست" کے قائل ہیں۔تخلیق کے بعد اگرچہ انسان ایک مستقل وجود کا مالک ہو گیا ہے لیکن اس کا مالک بننا درحقیقت اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے ہوا۔اگر خدا نہ ہوتا تو اس کا وجود بھی ممکن نہ تھا۔چنانچہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

خود را از وجودِ حق وجودی
خودی را از نمودِ حق نمودی

نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر
کجا بودی اگر دریا نہ بودی

خدا تعالیٰ کی جانب اپنی احتیاج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ آپ (اللہ تعالیٰ) کی جانب سے میسر ہے، یہ سب فیض یابی اللہ رب العزت کی جانب سے ہی ہے:

قلزمِ گردون میسر از فیضِ اوست
جوئی ساحل نا پذیر از فیضِ اوست

یہی اسلامی توحید ہے۔ اسی توحید کا صحیح مفہوم اگر انسان سمجھ لے تو اس کی شان اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ خدائے واحد لاشریک کے سوا اس کے دل میں کسی اور کا خوف باقی نہیں رہتا۔ وہ ''لا'' کی شمشیر سے دنیا اور مافیہا کی نفی کرکے جب ''الا اللہ'' میں ثابت قدم ہو جاتا ہے تو کسی اور الہ کے سامنے اپنی گردن خم نہیں کرتا اور نہ ہی کسی دنیاوی جاہ و جلال کی ہیبت اس پر طاری ہوتی ہے۔ نہ ہی کسی میر و سلطان کی شوکت و حشمت کو اپنے دل پر اثر انداز ہوتے ہوئے دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کا جادو اسے اپنے سحر میں گرفتار کر سکتا ہے۔ اس کے سینے میں کسی قسم کے خوف کا گزر نہیں ہو سکتا:

تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چوں جان اندر تنش
خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینہ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

فقط یہی نہیں کہ انسان توحید پر ایمان لانے سے دوسروں کے پنجۂ استبداد سے نجات پا جاتا ہے اور خوف و ہراس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے بلکہ اس (عقیدۂ توحید پر ایمان کی پختگی اور استحکام)

کی بدولت اور برکت سے اتنی قوت حاصل کر لیتا ہے کہ موجوداتِ عالم اس کے تابع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں:

ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست
جملہ موجودات را فرماں رواست

توحید کی برکت سے بنی نوع انسان میں وہ عالمگیر مساوات قائم ہوتی ہے کہ جس کی مثال دنیائے اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ غلام تھے لیکن کلمہ توحید کا اقرار کر لینے کے بعد وہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر اصحاب کبارؓ کے ہمدوش اور عزیز ہو گئے۔ اور ایک رشتۂ اخوت و مساوات سے منسلک ہو گئے۔ اسی رشتہ مساوات و اخوت اور کلمہ توحید پر ایمان کا ثمر ہے کہ گورے اور کالے، سیاہ و سرخ کی تفریق اور امتیازات کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ علامہ اقبالؒ اسی حقیقت کو بیان فرماتے ہیں:

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

یہی توحید ہے جس پر "تخلقوا باالاخلاق اللہ" (تم اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کرو) کی رو سے عمل کرنے سے انسان کا رنگ جہاں میں یگانہ و یکتا ہو جاتا ہے:

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو تیرے دل میں "لاشریک لہ"

اللہ رب العزت کی واحدانیت پر کامل یقین رکھنے والے افراد کسی طاغوتی طاقت اور غیر الٰہ کے سامنے کبھی جھکتے نہیں بلکہ ان کا یہ اختصاص بھی ہے کہ وہ دوسروں سے منفرد اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ توحید کے معنی دراصل یہی ہیں۔ چنانچہ اقبالؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی، جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

توحید ہی سے خودی کو تقویت پہنچتی ہے۔ توحید ہی دراصل "خودی" کا پوشیدہ راز ہے۔ خودی اگر تلوار ہے تو توحید "فساں" ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

توحید فہمی کے لئے علامہ اقبالؒ کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے:

با تو آموزم زبانِ کائنات
حرف و الفاظ است اعمالِ حیات
چوں حیات از مقصدے محرم شود
ضابطۂ اسباب ایں عالم شود
خویشتن را تابع مقصد کند
بہر او چیند، گزیند، رد کند
دست و پائے قوم را جنباند او
یک نظر صد چشم گرداند او
شاہدِ مقصود را دیوانہ شو
طائف ایں شمع چوں پروانہ شو
گرو بقدر یک نفس غافل شوی
در صد فرسنگ از منزل شوی

الغرض علامہ اقبالؒ نے مسلمان کے لئے ایمان کی بنیادی شرط عقیدۂ توحید پر کامل یقین و

ایمان اور پختہ روی کا درس دیا۔ اقبالؒ اپنے تمام فلسفہ و افکار کی بنیاد اسی عقیدے پر استوار کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرے تمام افکار، فلسفہ اور فکر کی بنیاد اور محور اسی نقطۂ توحید سے منسلک ہے۔ یہی وہ اساس ہے جو اقبالؒ کے فکر و فلسفے کو قوت نمو اور ترویج و ترقی کی منازل سے ہمکنار کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اقبالؒ اپنے افکار کی شیرازہ بندی کے کو اپنا کمال کبھی نہیں کہتے بلکہ اس نظریہ توحید پر کامل ایمان کی بدولت انہیں جو خدا داد قوت و بصیرت عطا ہوئی اقبالؒ اسی کو سرمایہ حیات سمجھتے ہیں۔

"لا الہ" سرمایۂ اسرارِ ما

رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

باب دوم

اقبالؒ کی قرآنی بصیرت

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

قرآنِ پاک کی تعلیمات اس بات کی متقاضی ہیں کہ انسان ہر وقت اس پر غور و فکر کی عملی صورت پیدا کرتا رہے اور اسرارِ کائنات سے نقاب کشائی اس کا مطمع نظر ہو۔ وہ تسخیرِ آفاق و افلاک تک رسائی کے تمام ممکن راستے تلاش کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دماغ اور عقلِ سلیم عطا کی اور اسے عقل کے ساتھ شعور کی دولت سے بھی مالا مال کیا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے بُرے کی تمیز کر سکے۔ قرآنِ پاک میں جہاں فلسفۂ حیات اور اسلامی طرزِ زندگی کی تعلیمات ہیں وہاں فکر و تدبر، فلسفہ، حیات، سائنس، فلکیات و ارضیات، غرضیکہ تمام مادی علوم اور سائنسی موشگافیوں کے دقیق ترنکتوں کی نقاب کشائی کے واضح اور مدلل اشارے ملتے ہیں وہاں یہ تمام انسانوں اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے علوم کا بیش بہا خزانہ بھی ہے۔ قرآنِ پاک اپنے پڑھنے والے سے صرف صحیح اندازِ فکر، تدبر اور بصیرت کا تقاضا کرتا ہے۔ غیر مسلموں نے قرآنِ پاک سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ جدید سائنسی ترقی میں تاریخ ساز کام بھی کیا۔ نئی نئی ایجادات اور علمی موشگافیاں کیں، لیکن دانستہ یا نادانستہ طور پر مسلمان قوم کی اس عظیم علمی دولت سے انہیں ناواقف رکھنے کے لئے، واضح اور برملا یہ اظہار بھی نہیں کیا کہ ان کے تمام سائنسی علوم کی اساس اور بنیاد قرآنِ پاک کی فراہم کردہ ہے۔ کتنی بدقسمتی اور بدنصیبی کی بات ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے اپنے عظیم اور لافانی منشورِ حیات سے اخذ و استفادہ کی کبھی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ وہ جدید علمی ترقی اور اس کا ذریعہ مغربی علوم اور افکار کو

سمجھتے ہیں۔ کسی بھی علمی اور تحقیقی کام میں کوئی ایسا ماموں نہیں جو غیروں کا دستِ نگر نہ ہو۔ ہر ایک اپنے مقالہ جات اور تحقیقات میں غیر مسلم مفکرین کے اقوال کو بطور سند پیش کر کے فخر محسوس کرتا ہے۔ آج بھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی کہ ہمارا علمی، مذہبی اور تخلیقی و تحقیقی ورثہ ہمیں کب اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم دوسروں کے علمی کاموں کو اپنے کام کی بنیاد قرار دیں۔ ہمارے پاس قرآنِ پاک سیرتِ طیبہ اور اسلامی تاریخ میں ایسے ایسے کام ہیں ، ایسی ایسی لازوال مثالیں ہیں جو لادین قوموں کے لئے آج بھی باعثِ حیرت اور لاینحل گتھیاں ہیں۔ علامہ اقبالؒ بھی اسی سوچ کے حامی اور انہی اقدار کے وارث تھے۔ وہ دینِ اسلام کو تمام علوم کی اساس قرار دیتے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے قرآنِ پاک کی عملی تفسیر پیش کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اسلام میں اس وقت تک رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے بعض جلیل القدر صحابہ کرامؓ کے بعد جس قدر بھی مفکر پیدا ہوئے ہیں، اقبالؒ کا مقام ہر ایک لحاظ سے، ان سب سے بلند ہے۔ انہوں نے تین زبانوں میں قرآن کی عملی تفسیر پیش کی ہے اور وہ قدیم و جدید فکر سے آشنا تھے۔ اگرچہ انہوں نے باقاعدہ طور پر تفسیر نہیں لکھی مگر قرآن کی تفسیر لکھنے اور پیش کرنے کے اہل تھے۔ وہ تمام قرآنی مسائل اور اس کے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے اور کسی حد تک اس کام کو مکمل بھی کیا۔ وہ اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ رسولِ اکرم ﷺ کی شکایت (قال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا) حشر کے روز جو وہ اللہ تعالیٰ سے کریں گے بالکل بجا ہوگی۔ اسی لئے فرمایا:

خدا را ز مہجوری قرآن شدی
شکوہ سنج گردشِ دوران شدی

علامہ اقبالؒ کی زندگی اور ذہنی ارتقاء کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام نظریات پر غور و فکر کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے تمام نظریات کی بنیاد قرآن اور قرآنی تعلیمات پر ہے۔ اقبالؒ نے قرآن کو اچھی طرح پڑھا اور اس کی تعلیمات کو اپنے اشعار اور خیالات میں پیش کیا۔ اقبالؒ کا

کوئی نظریہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات سے متصادم ہو۔ اسی بات سے ان کے نظریہ توحید کی وضاحت ہوتی ہے۔ جب وہ قرآن کی تعلیمات سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں تو ظاہر ہے انہیں اس کے بھیجنے والے یعنی اللہ رب العزت کے وجود پر کوئی شک ہو سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے وجود کا اثبات، اس کی واحدانیت کا تصور، قرآن کی حقانیت اور قرآن لانے والی ہستی کے من جانب اللہ ہونے کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔ لہٰذا اقبالؒ اس ہستی کے نہ صرف پیروکار ہیں بلکہ حقیقی معنوں میں عاشقِ صادق ہیں۔ انہوں نے جس نظامِ حیات کا نمونہ پیش کیا ہے اقبالؒ کے نزدیک وہی نظامِ حیات صحیح نظامِ زندگی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں عملی زندگی میں پیش آنے والے معاملات سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ اقبالؒ کا نظریہ حرکت و عمل بھی قرآن سے ماخوذ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی قوم عمل کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ جو قومیں اپنی ترقی اور خوشحالی کے لئے جدوجہد نہیں کرتیں وہ اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔ علامہ اقبال کاہلی، سستی، اور کسی غیبی امداد پر تکیہ کرنے کے سخت مخالف ہیں۔ وہ حقائق سے فرار حاصل کرنے اور آنکھیں چرانے کے بجائے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے پر زور دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مروجہ معنوں کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک نام نہاد تصوف انسان کو بے عملی کی تلقین کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں جہاد کا نظریہ اور تصور بھی ہے۔ اقبالؒ دنیا میں باطل قوتوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے جہاد کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اس راز کو کس طرح پایا؟ اور اس حقیقت کے منکشف ہونے پر ان پر زندگی، خدا اور کائنات کے کئی سربستہ اسرار بھی کھلے لیکن ان کی وہ کوشش اور جستجو، جو اس راز تک رسائی پانے کے دوران رہی اس کی ایک جھلک ان کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کی زبانی سنیئے، وہ لکھتے ہیں:

"......ابا جان کے عقیدت مندوں میں سے ایک حجازی عرب بھی تھا، جو انہیں کبھی کبھی قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اس عرب کی آواز بڑی پیاری تھی۔ جب بھی اس سے قرآن مجید سنتے تو مجھے بلا بھیجا کرتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار اس نے سورۃ مزمل پڑھی اور آپ اتارو ئے کہ تکیہ

آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکا تو آپ نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے "تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہئے"۔ میں نے اماں جان کی موت پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے یا اپنا کوئی شعر پڑھتے، یا رسولِ اکرم ﷺ کا اسمِ مبارک ان کی زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں......"

ایک مردِ مومن پر تلاوتِ قرآن کرتے وقت رقت کا طاری ہوجانا یا سید یوم النشور ﷺ کا ذکرِ خیر کرتے یا سنتے وقت فورِ شوق سے آنکھوں کا ڈبڈبا جانا عام بات نہیں، لیکن ان کیفیتوں کا طاری کرنا، عشق کا متقاضی ہے اور یہ ذوق و شوق بڑی قربانی اور قلبی ریاضت کا متقاضی ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک کے مغز تک رسائی کے لئے وسیع مطالعہ اور قدیم و جدید فلسفۂ حیات نیز عالمی ادبیات و تاریخ سے گہری شناسائی انتہائی ضروری ہے۔ اقبالؒ جیسے عظیم مفکر اور مدبر نے اگر یہ شعر ہم تک پہنچایا ہے تو اس کے پیچھے وسیع مطالعہ، گہرا مشاہدہ اور ریاضت کا عمل کارفرما ہے:

شوق میری لے میں ہے، شوق میری نے میں ہے

نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

اس نغمۂ اللہ ہو کو ہر دم اور ہر آن الاپنے والے علامہ اقبالؒ نے اس جذبے کا بنیادی عنصر "شوق" قرار دیا ہے۔ یہی شوق، عشق کا دوسرا نام ہے۔ عبودیت کے لئے عشق لازمی جزو ہے۔ اس عشق سے انسان کو یقین کی دولت ملتی ہے۔ انسان کے علم اور عمل میں پختگی آتی ہے۔ یہی پختگی اسے کسی بھی منزل پر قیام کرنے کے بجائے زندگی کے حرکی پہلو پر عمل پیرا ہونے پر اکساتی رہتی ہے اور وہ راہ نوردِ شوق کی مثال بن کر کوئی بھی منزل قبول کرنے سے انکاری رہتا ہے۔ اقبالؒ اسلام کے نظریہ ارتقاء کے زبردست حامی تھے اور اس کی بنیادی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو جامد زندگی سے نجات دلانے کے خواہاں تھے۔

علامہ اقبالؒ قرآن کی آیات پر ہر وقت غور کرتے تھے۔ ایک دن محمد شفیع (م۔ش) نے کوئی

بات کرتے ہوئے اقبالؒ کی فلاسفی کی اصطلاح استعمال کی۔ اقبالؒ فرمانے لگے "اقبالؒ کی کوئی فلاسفی نہیں، میری تمام فلاسفی، فکر اور کلام قرآنِ کریم پر غور وخوض کا نتیجہ ہے"۔ ایک دن شام کو چوہدری محمد حسین سے گفتگو کرتے ہوئے پوچھا "چوہدری صاحب! کیا آخرت میں بھی قرآن کریم سے لطف اندوز ہونے کے مواقع ملیں گے؟" پھر خود ہی فرمایا: "ہاں ایسا (ضرور) ہوگا کیونکہ قرآن کریم میں اللہ نے فرمایا ہے کہ "فی لوحٍ محفوظ"۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اقبالؒ کے ایک لیکچر میں ان کے مقولے (Time is God) "وقت خدا ہے"...... کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "دراصل اقبالؒ نے یہ حوالہ قرآن سے دیا ہے، چونکہ وقت مسلسل ارتقاء میں ہے اس لئے اسے خدا سے تشبیہ دی گئی قرآن میں بھی لکھا ہے "مجھے برا مت کہو میں خود وقت ہوں"۔

ڈاکٹر وقار راشدی "معارفِ اقبال" (کتاب) پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "...... عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ لازم وملزوم ہیں۔ اقبالؒ کی زندگی قرآن وحدیث کی تفہیم اور اس (اللہ) کے رسول ﷺ کی اطاعت واتباع کے لئے وقف تھی.............. علامہؒ کی تعلیم وتربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی۔ انہیں اوائل عمر ہی سے قرآن وحدیث سے گہرا شغف رہا یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام قرآن و حدیث کا ترجمان ہے۔ اقبالؒ نے قرآن کو سمجھنے کے لئے نیا انداز فکر کی تشکیل کی تھی۔ اسی طرح انہوں نے حضور انور ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے صحیح فائدہ حاصل کرنے کے لئے ایسے نکات وضع کیے کہ عموماً اہلِ علم سے پوشیدہ ہیں"۔

علامہ اقبالؒ کی نگاہ قرآن اور انسان پر بڑی وسیع تھی۔ انہیں قرآنِ حکیم پر غور وخوض کرنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔ ان کے لئے ہر عقیدے کو پرکھنا آسان ہوگیا تھا۔ انہوں نے ایک ایسا مقام پالیا تھا جہاں کھڑے ہوکر وہ ایک طائرانہ نظر تمام عالمِ اسلام پر ڈال سکتے تھے اور ہر مسئلہ کو اپنے رنگ وروشنی سے دیکھ سکتے تھے۔ اقبالؒ نے بڑی گہرائی تک پہنچ کر قرآن میں غوطہ زنی کی تھی تب ہی تو انہوں نے قرآنِ

پاک کو محض کتاب نہیں سمجھا بلکہ کہا کہ ..... ایں کتاب نیست چیزے دیگر است۔

بلاشبہ اقبالؒ نے قرآنِ پاک کے مغز اوراس کی تعلیمات کی روحانی اہمیت تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اسی لئے اقبالؒ نے مسلمان ہونے کے لئے اولین شرط یہ رکھی کہ مسلمان ہونے کے لئے بہترین رہنما اور ہادی اگر ہے تو وہ قرآنِ پاک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کی تعلیمات اور فلسفۂ حیات پر عمل پیرا ہو کر ہی کوئی فرد مسلمان کہلانے کو حقدار ہو سکتا ہے:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن

نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اقبالؒ کے کلام کا اگر قرآنی تعلیمات کے تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو قرآنِ پاک کے ایک بڑے حصے کی تفسیر شعری صورت میں ملتی ہے۔ قرآن و حدیث کی بیشتر تعلیمات کلامِ اقبالؒ میں موجود ہیں۔ ہمارے درسی نصاب میں اقبالؒ کو مفکرِ پاکستان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جبکہ اس حیثیت کے علاوہ اقبالؒ کی تعلیمات کو قرآن و حدیث کے حوالے سے پیش کئے جانے کی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ اقبالؒ نے مشرق و مغرب کے تمام علوم کی اساس اور بنیاد قرآن کو قرار دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات اور فلسفۂ حیات کی روح کو تلاش کرنے کے لئے بہر حال ہمیں قرآن و حدیث کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے اور یہی اقبالؒ کا نظریۂ حیات ہے۔ یہی ان کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

اقبالؒ نے قرآنِ حکیم کی ایک عملی تفسیر پیش کی ہے جو ان کے کلام میں بکھری پڑی ہے۔ علامہ اقبال کے تمام کلام میں (خواہ وہ نظم ہو یا نثر، اردو، فارسی یا انگریزی میں) کوئی نہ کوئی قرآنی آیت کا ٹکڑا منسلک ہے اور وہ کسی نہ کسی مسئلے کا حل پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے کلام کو مجموعی طور پر تفسیرِ قرآن یا عملی تفسیرِ قرآن سمجھنا چاہیئے۔ یہ بات ان کے منظوم کلام میں ہی نہیں بلکہ ان کی نثری تخلیقات میں بھی جا بجا ملتی ہے۔ ان کی انگریزی نثر یعنی خطبات کے متعلق ایک جرمن عالم نے کہا کہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" عصرِ حاضر کا سب سے زیادہ تعجب انگیز مظہر ہے"۔

علامہ اقبالؒ نہ صرف تفسیری پہلوؤں کو ہی راہِ راست پر لائے تھے بلکہ آیاتِ قرآنی کے بعض مفاہیم پر بھی نظرِ ثانی فرمائی تھی اوران کو نئے معنی پہنا کر ایک تازہ حقیقت کو اُجاگر کر دیا۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ علمائے اسلام نے یونانی علوم سے متاثر ہو کر قرآن کی تفسیریں کی ہیں مگر اب زمانہ بدل گیا، اس کی قدریں بدل گئیں اور تقاضے مختلف ہو گئے ہیں، نیز جدید سائنسی تحقیقات نے قرآن پر بے اندازروشنی ڈالی ہے۔ آج وقت کا تقاضا کچھ اور ہے اور قرآن کی متاشبہ آیات پر نئی روشنی ڈالی جارہی ہے۔ لہٰذا انہوں نے قرآنِ پاک کی جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ تفسیر وتشریح پر زیادہ زور دیا۔

علامہ اقبالؒ کے سینکڑوں اشعار میں آیاتِ قرآنی کے ٹکڑے آ گئے ہیں۔ جس میں آیات کی تشریح کی گئی ہے اور بعض جگہ ایک ایک آیت کے ٹکڑے کے لئے کئی کئی اشعار آئے ہیں۔ ان سب کا یہاں درج کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ صرف ایک مقام پر علامہ اقبالؒ نے پوری سورۃ کی تفسیر لکھی اور وہ سورۃ اخلاص ہے۔ جس کی تفسیر مثنوی اسرارِ خودی میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کسی بھی مکمل سورۃ کی تفسیر نہیں لکھی اور مکمل سورۃ کو اشعار میں تفسیری طور پر لانا ضروری بھی نہ تھا۔ صرف سورۃ اور آیات کے ان اہم حصوں کو علامہ اقبالؒ نے لکھا جن سے اصل مقصد کی وضاحت اور حل ہو سکتا تھا۔ اگر اس معیار کو سامنے رکھ کر علامہ پورے قرآنِ پاک کی تفسیر لکھ دیتے تو اس کی اہمیت میں کس کو شک ہو سکتا تھا۔ علامہ اقبالؒ کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ جدید فکر بہت آگے نکل گئی ہے۔ جس سے مسلمانوں کو آشنائی و آگاہی نہیں۔ اگرچہ اس طرف قرآنِ پاک نے اشارہ بھی کر دیا ہے۔ مثلاً تخلیقی ارتقاء کا مسئلہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے برگساں کا بدجہ غائیت مطالعہ کیا تھا اور اس کے نظریے کو نہ صرف قرآن میں تلاش کیا بلکہ مسلمان مفکرین کے کلام سے بھی اخذ کیا۔ چنانچہ ''کن فیکون '' کی تفسیر میں وہ ایک بڑا ہی عمدہ شعر کہہ گئے ہیں، جس میں تمام جدید فکر کو سمو دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون!

علامہ اقبالؒ نے قرآن وحدیث میں غوطہ زن ہو کر اپنے فکر و فلسفے کی اساس بھی قرآنی فلسفۂ حیات کو ہی قرار دیا ہے اور قرآن کے افکار پر اپنے تاثرات یا قرآنی تعلیمات پر اپنے خیالات کو ہم تک پہنچانے کے لئے اپنی شعری و نثری تخلیقات کے ذریعے کمال ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ انہوں نے ہمیں قدیم وجدید فکر سے آشنا کرانے کے لئے بھرپور سعی کی اور فرمایا کہ قرآن کو محض صحیفۂ آسمانی جان کر اس کا ادب کرنا زندگی نہیں بلکہ اس میں غوطہ زن ہو کر اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہی نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسی لئے تو اقبالؒ نے قرآن پاک کا آسمانِ دیگر سے نزول ہونا فرمایا ہے۔

ع ایں کتاب از آسمانِ دیگر است

باب سوم

علامہ اقبالؒ اور عشقِ رسول ﷺ

وہ دانائے سبلؐ ختم رسلؐ مولائے کلؐ جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

(اے نبی ﷺ) لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری (محبوب خدا ﷺ کی) پیروی اختیار کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے)۔

اس اجر و انعام کی بشارت کے بعد یہ سخت وعید بھی ساتھ لگی ہوئی ہے:

(اے حبیب ﷺ) اگر وہ آپ کی دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں)۔

گویا خود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و غضب ناکی اور اپنے بندوں کے ساتھ اس کے سلوک کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو اپنے دل میں اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں کیا مقام دیتے ہیں۔ سرکار دو عالم ﷺ سے کٹ کر اللہ تعالیٰ سے نہیں جڑا جا سکتا اور حضرت محمد ﷺ سے جڑ کر اللہ تعالیٰ سے جدا نہیں رہا جا سکتا۔ حبِ رسولِ مقبول ﷺ ہی ایمان کی بنیاد اور متاعِ مومن ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بڑی جامعیت کے ساتھ اس شعر میں سمو دیا ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ اقبالؒ کو اگرچہ مدینۃ الرسول ﷺ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن ان کا پورے کا پورا کلام اور نثری سرمایہ اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان کا دل عشقِ رسول ﷺ سے ہمیشہ منور رہا۔ عشقِ رسول ﷺ اقبال کا تصورِ حیات ہے اور وہ اسے حاصلِ کائنات سمجھتے تھے۔ ان کے تخیل کا سارا زور اور فکر کی بھرپور رسائی اس ذاتِ اقدس ﷺ کی ثنا اور ذکرِ جمیل کے لئے ہے۔ آخری ایامِ زندگی میں ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ رسولِ پاک ﷺ اور مدینہ کا ذکر سنتے ہی ان کی آنکھوں سے برسات جاری ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔ ذکرِ رسول ﷺ لب پہ آتے ہی بے خودی و سرخوشی اور والہانہ جذب و کیف کا عالم طاری ہو جاتا۔۔۔۔۔ اور دل کے جذبات لفظوں کی صورت میں قرطاس کی زینت بننا شروع کر دیتے۔۔۔۔۔ اسلوب و بیان کی رعنائیاں، جلال و جمال بداماں ہو جاتیں۔۔۔۔۔ آپ کے کلام میں سفرِ حجاز کی روداد اور ان کی تمام تر تخلیقی قوت، جذبۂ عشقِ نبی ﷺ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔۔۔۔۔ جس میں ان کا طائرِ فکر ہمیشہ رسالتمآب ﷺ کے عشق کی جذب و مستی میں سرشار مدینہ و یثرب کی کیف آور فضاؤں میں محوِ پرواز نظر آتا ہے۔

انہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کے حضور اپنی محبت و عقیدت اور اخلاص و وفا کا نذرانہ پیش کیا ہے۔۔۔۔۔ آپ نے جہاں بھی رسولِ پاک ﷺ کے حضور اپنے خیالات و جذبات اور اپنی ملت و معاشرہ کی دلگداز تصویر پیش کی ہے۔ اس موقع پر اقبالؒ کے جوہرِ شاعری خوب کھلتے ہیں جن میں معانی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔۔۔۔۔ ارمغانِ حجاز اور جاوید نامہ کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے، جہاں وہ حقائق جن کی لگام اقبال نے مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں رکھی، بے حجاب اور بے نقاب ہو کر سامنے آتے ہیں اور اپنا رنگ دکھاتے ہیں:

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوقِ حضوری طول دادم داستانے را

اقبالؒ بسترِ علالت پر تھے، خواب میں سرسید سے ملے اور سرسید نے مشورہ دیا کہ اپنی علالت

کی فریاد رسالتمآب ﷺ کے حضور پیش کروں گا۔ اقبالؒ کو قصیدہ بردہ کا بوصیری یاد آ گیا، جو برص کے موذی مرض میں مبتلا تھا۔۔۔۔۔ بارگاہِ نبوی ﷺ میں قصیدہ گزارا۔۔۔۔۔ اور ایک روایت کے مطابق خواب میں رسولِ پاک ﷺ کی زیارت سے فیض یاب ہوا اور چادر عطا ہوئی (عربی میں بردہ چادر کو کہتے ہیں)۔۔۔۔۔ رسولِ اکرم ﷺ کی نگاہِ التفات سے مرض سے رہائی ملی۔۔۔۔۔ اقبالؒ نے بھی قصیدہ بردہ کی پیروی کی اور "در حضور رسالت مآب" کے عنوان سے ایک نظم گزاری۔۔۔۔۔ اس عریضہ کی برکت سے جان لیوا مرض سے نجات مل گئی۔۔۔۔۔ نظم کے پہلے بند میں حضور ختمی المرتبت ﷺ کے دُنیا پر الطافِ بے پایاں کا ذکر سنیئے۔۔۔۔۔ ثنائے محمد ﷺ میں یوں لب کشائی کرتے ہیں:

معنی جبریل و قرآن است او
فطرت اللہ را نگہبان است او
حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج
بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج
صحبتِ او ہر خزف را گوہر کند
حکمت او ہر تہی را پر کند

اقبالؒ کو اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ محبت پیغمبرِ اسلام ﷺ سے تھی۔۔۔۔۔ وہ صحیح معنوں میں عاشقِ رسول ﷺ تھے۔ وہ حضور ﷺ کو اپنا سب کچھ، اپنا آقا و مولا سمجھتے تھے۔۔۔۔۔ پتہ نہیں انہوں نے عشق کی اس بیقراری میں آنسوؤں کی کتنی ندیاں بہائی تھیں۔۔۔۔۔ راتوں کی تنہائی۔۔۔۔۔ سحر کے اندھیرے اور اُجالے میں۔۔۔۔۔ اور دن کی گہما گہمی میں۔۔۔۔۔ انہوں نے قرآن اور صاحبِ قرآن کی شخصیت پر غور و خوض کرنا زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رکھا۔۔۔۔۔ ان کے کلام میں پیغمبرِ اسلام ﷺ سے والہانہ وابستگی اور بے پایاں عشق کے سحر انگیز اشارے ملتے ہیں۔

انہوں نے عالمِ خیال میں مدینہ اور مکہ کا سفر کیا۔۔۔۔۔ اور اس تصور میں وہ قافلۂ شوق کے

ساتھ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ذوقِ حضوری اور شوق و محبت کے عالم میں گرم صحرا انہیں ریشم سے بھی نرم محسوس ہوتی ہے۔۔۔۔۔ان کا دل ریت کے ذرات کی مانند دھڑکتا ہے۔۔۔۔۔اور ساربان سے ان دھڑکتے ذروں کا خیال کرنے کو کہتے ہیں اور نرم روی اختیار کرنے کو کہتے ہیں:

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است
شبش کوتاہ و روز او بلند است
قدم اے راہ رو آہستہ۔۔۔۔۔؟
چو ما ہر ذرہ او درد مند است

آپؒ نے اپنے مجموعہ کلام کا نام ارمغانِ حجاز رکھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ پورے عالمِ اسلام کے لئے ایک مبارک تحفہ اور نسیمِ حجاز کا ایک مشکبار جھونکا ہے:

بادِ نسیم آج بہت مشکبار ہے
شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

"ارمغانِ حجاز" میں وہ خدائے تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کے اعمال کا حساب رسولِ اکرم ﷺ سے پوشیدہ طور پر لیا جائے تاکہ انہیں خواجہ دوعالم ﷺ کے سامنے شرمندگی نہ ہو:

بہ پایاں چوں رسید ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہؐ ما را
حساب ما ز چشمِ او نہاں گیر

عشقِ نبی ﷺ کی انتہائی کیفیت "ارمغانِ حجاز" کے اس بے مثال قطعہ سے ظاہر ہوتی ہے جس میں وہ حجاز کے روحانی سفر کو بیان کرتے ہیں اور حق تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ آپ تو یہیں کعبہ میں رہ

کر اپنے خاص بندوں سے ملیے ------لیکن مجھے منزلِ دوست کی تمنا ہے------اور اس کے لئے میں مدینہ جارہا ہوں:

بدن وا ماندہ و جانم در تگ و پوست
سوئے شہوں کہ بطحا در رہ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم سوئے منزلِ دوست

اقبالؒ کو حضور ﷺ کا خیال آتے ہی ایک تڑپ محسوس ہوتی اور ایک اضطراب و بیقراری کا عالم طاری ہو جاتا ------اقبال کا عشقِ رسول ﷺ کے لئے زندہ اور مظہر کلام تو کیا ارمغانِ حجاز ہے لیکن دوسرے کلام میں بھی اقبالؒ نے عشقِ نبیؐ اور عشق کے جذبات کے بحرِ بیکراں کی موجوں کی جھلکیاں دکھا کر ہمیں تقاضائے عشق کی مجازی اور حقیقی رفعتوں سے روشناس کرانے کی بھرپور سعی کی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ان کی محبت اور اخلاص انتہا درجے کا تھا اور ان کے ذاتی خیال میں اطاعتِ رسول ﷺ کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے اور نبی اکرم ﷺ ہی کی تعلیمات اور سیرت کی روشنی میں انسانی فلاح کا راز مضمر ہے۔

اقبالؒ نے دانشکدہ فرنگ میں ایک عمر گزاری ------لیکن ان کی جذباتی، روحانی، اخلاقی اور فکری وابستگی ہمیشہ رسولِ پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ہی رہی ------اور بلاشبہ حُبِ صادق اور عشقِ حقیقی ہی قلب و نظر کے لئے پاسبانی و حفاظت کی ضمانت بنا رہا اور اقبالؒ کے لئے خاکِ نجف و مدینہ سے ہی بصیرت کے چشموں کے سوتے پھوٹتے رہے:

خیرہ نہ سکا مجھے جلوہ ء دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

مدینہ اور صاحب دو عالم ﷺ سے ان کی وابستگی اس حد تک جا پہنچی تھی کہ انہیں یثرب کی

خاک کے ذروں کا ہمسر اور کوئی نظر ہی نہ آتا تھا اور اس مٹی اور شہر سے انہیں اتنی عقیدت اور جذباتی وابستگی ہوئی کہ دو عالم سے خوش تر اگر کسی چیز کو قرار دیا تو وہ خاکِ یثرب تھی۔۔۔۔۔ساتھ ہی خاکِ مدینہ کی اس اہمیت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اقبالؒ کے کلام کی ابتدا بھی نعت ہے اور انتہا بھی۔۔۔۔۔ان کے کلام کا سنجیدگی سے اور بغور مطالعہ کرتے وقت یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اُس وقت تک ملت اور ملت کے بخشے ہوئے فضائل کا ادراک ممکن نہیں جب تک عشقِ حقیقی اور عشقِ نبی ﷺ کے امتزاج سے ایک مردِ قلندر کا تصور قائم نہ کرلیا جائے۔۔۔۔۔اور اس مردِ قلندر کے مقام پر اقبالؒ کو فائز کر کے اگر ان کے کلام کو دیکھا اور پرکھا جائے تو یہ اسرار از خود کھلتے ہیں۔۔۔۔۔کہ یہ فیضان ہے عشقِ رسول ﷺ کا کہ جس نے ان کے کلام کو لازوال اور گراں بہا بنا دیا۔۔۔۔۔اقبالؒ ان سب نام نہاد مذہبی اور روحانی لیڈروں سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں جنہوں نے عشقِ رسول ﷺ کی آگ سے اپنے من کی دُنیا کو روشن نہیں کیا۔۔۔۔۔وہ کہتے ہیں کہ میں ان سب روحانی لیڈروں سے بری ہوں جو آپ ﷺ کے پیغام کی آفاقیت سے نا آشنا ہیں:

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا

کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے

ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

اقبالؒ نے عشق کو ایک قوت اور اسمِ محمد ﷺ کو مینارۂ نور کہا ہے۔انہوں نے نوجوانانِ ملت کو اس طرح سے یہ پیغام منتقل کیا ہے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

علامہ اقبال عشقِ الٰہی کے لئے محبتِ رسول ﷺ کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔۔۔۔۔اور اس حقیقت کی جانب متوجہ کرتے ہیں کہ دنیا و آخرت اور ملت کی ساری کامرانیاں عشقِ رسول ﷺ پر ہی منحصر ہیں فرماتے ہیں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰؐ است
ہر کہ عشقِ مصطفےٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرہ عشقِ نبیؐ از حق طلب
ز آنکہ ملت را حیات از عشقِ اوست
برگ و سازِ کائنات از عشقِ اوست

اقبالؒ کی نظر ہمہ وقت رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے فیض یاب ہونے کو مچلتی ہوئی نظر آتی ہے۔۔۔۔۔وہ اپنی پریشانی کی حالت میں (چاہے وہ روحانی ہو یا مادی۔۔۔۔۔قلب و نظر کی ہو یا علم و حکمت کی) ہر مشکل میں رسولِ اکرم ﷺ کی ذات پر انحصار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے
کرے یہ کافرِ ہندی بھی جراْتِ گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصال مصطفیٰؐ افتراق بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربیؐ سے ہے عالم عربی

فقیر سید وحیدالدین، روزگارِ فقیر میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ان (اقبالؒ) کی طبیعت ذرا شگفتہ تھی ..... یعنی باتیں کرنے کے موڈ میں تھے ..... میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟ فرمایا ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوت دی ..... اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے چائے پی کر چلے نہ جانا، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ہم لوگ چائے پی کے چلے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے ..... "اقبال! مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے پیغمبرﷺ پر قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں عربی آتی تھی، انہوں نے قرآنِ کریم عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اتری تھی؟"۔ میں نے کہا "یہ عبارت ہی اتری تھی"۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا "اقبال تم جیسا پڑھا لکھا آدمی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ عبارت ہی اتری تھی؟ ....." میں نے کہا ..... "ڈاکٹر لوکس ..... یقین! میرا تجربہ ہے کہ مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبرﷺ پر عبارت کیوں پوری نہیں اتری ہو گی۔"

یقین کی یہی دولت تھی جو اقبالؒ کو عام لوگوں سے ممتاز بنا گئی ..... اس یقین اور عشق کے امتزاج سے ہی اقبالؒ نے اپنے کلام کو مرصع کیا اور عشق رسولﷺ کی شمع، جو ان کے دل میں فروزاں تھی، سے پورے عالم کو منور کر دیا ..... انہی لازوال اور ابدی صداقتوں کے طفیل وہ پورے عالم میں اپنے افکار و نظریات کو پھیلانے میں کامیاب ہوئے اور شاعرِ مشرق، مصورِ پاکستان اور عظیم مفکر کے طور

پر اپنے آپ کو منوایا۔

عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ لازم و ملزوم ہیں۔۔۔۔۔اقبالؒ کی زندگی قرآن و حدیث کی تفہیم اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع و اطاعت کے لئے وقف تھی۔ان کی تربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی۔انہیں اوائل عمر سے ہی قرآن و حدیث سے شغف رہا۔۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام قرآن و حدیث کا ترجمان ہے۔اقبالؒ نے اسلام کو سمجھنے کے لئے نئے اندازِ فکر کی تشکیل کی تھی۔۔۔۔۔اسی طرح انہوں نے حضورِ انور ﷺ کے سیرتِ طیبہ سے اخذ و استفادہ کے لئے ایسے ایسے نکات وضع کئے جو عموماً اہلِ علم سے پوشیدہ ہیں۔

عشقِ رسول ﷺ کی ایک اور شرط یہ بھی ہے کہ مومن ہر وقت اطاعت نبی ﷺ کو اپنا شعار بنائے اور آپ ﷺ کی سیرت اور حیاتِ طیبہ سے مسلسل اخذِ نور کرتا ہوا نظر آئے۔۔۔۔۔فکر و عمل، روحانیت و بشارت کے ازلی و ابدی سرچشمے یعنی قرآنِ پاک کو دنیا کا سب سے بڑا رہنما سمجھتے ہوئے اس پر عمل پیرا رہے، جس کے جلو میں رہ کر ہی وہ نیابتِ الٰہی کے اس مقام پر پہنچ سکتا ہے کہ جہاں جلال و جمال ایک سطح پر آ کر ملتے ہیں۔۔۔۔۔اور بندہ و مولا ایک ہو جاتے ہیں:

بے حجابی سے تیری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

باب چہارم

علامہ اقبالؒ اور نظریہء خودی

خودی کے نگہبان کو ہے زہر ناب
وہ نان جس سے جاتی رہے اس کی آب

علامہ اقبالؒ ان برگزیدہ اور جلیل القدر ہستیوں میں سے ہیں جن کی یاد کروڑوں انسانوں کے دلوں میں تا قیامت جاگزیں رہے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ سید جمال الدین افغانیؒ کے بعد اقبالؒ ہی وہ واحد ہستی ہیں کہ جنھوں نے شرق کے تنِ مردہ میں زندگی کی حرارت کی شمع روشن کی اور اس مشن میں اپنی پوری زندگی تیاگ دی اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اقبالؒ کی آفاقی صدا نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر سنائی دینے لگی۔ اقبالؒ نے سوئی ہوئی قوم کو درسِ خودی دیا اور اسے اس کی حقیقی اقدار اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور انسان کی روحانی اور حقیقی قدر و منزلت سے روشناس کیا۔ اقبالؒ کے فلسفہ حیات کی بنیاد اور مرکز و محور ہی خودی کا تصور ہے اور باقی تمام کام کو آپ اس نکتہ کی تفسیر و تشریح کہہ سکتے ہیں۔

خودی کیا ہے؟ اور اس کے ماخذات کون کون سے ہیں؟ خودی، خود اقبالؒ کے اپنے الفاظ میں ایک "وحدتِ وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ ایک لازوال حقیقت ہے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے"۔ یہ انسان کے اندر ایک قوتِ خاموش ہے جو عمل کے لئے بیتاب ہے:

قوتِ خاموش و بیتاب عمل
از عمل پابند اسباب عمل

خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

ادبیات فارسی اور اردو میں یہ لفظ عموماً "غرور"، "نخوت" اور "تکبر" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً عراقیؔ کہتے ہیں:

اول اینست و آخرش دانی چیست
خود را ز خودی پرداختن است

مولانا جامیؔ فرماتے ہیں:

چو تیغ و تیر جفا خورم ز حسود
بسوخت ترک خودی خود بہ نیستی سپرم

البتہ علامہ اقبالؒ کے مرشد روحانی اور مشہور صوفی شاعر مولانا رومیؔ نے خودی کو مذکورہ معنی سے ہٹ کر بھی استعمال کیا۔ ان کے ہاں یہ لفظ احساسِ نفس، ہوشیاری، خودشناسی اور خودداری کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

با خودی تو لیک مجنوں بیخود است
در طریق عشق بیداری بد است

با خودی با بیخودی دو شار زو
بیخود اندر دیدہ خود خسار زو

می گریزاند از خودی در بیخودی
یا بمستی یا بشغل ای مہتدی

صد ہزاران فضل داند از علوم
جان خود را می نداند آں ظلوم
داند او خاصیت ہر جوہری
در بیان جوہر خود چوں خری
قیمت ہر کالہ می دانی کہ چیست
قیمت خود را ندانی ز حقیقت

علامہ اقبالؒ مولانا رومیؒ کو اپنا روحانی مرشد مانتے ہیں۔لہٰذا ہو سکتا ہے انہوں نے ان سے ہی متاثر ہو کر اس مخصوص نظریے کو زندہ کرنے اور عوام وخواص تک منتقل کرنے کے لئے اتنی کوشش وسعی فرمائی ہو۔اس نظریے کی تبلیغ علامہ کا خاص مطمحِ نظر تھا۔اس کے مفہوم کو اجاگر کرنے کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر قوتیں صرف کیں۔انہوں نے اس عنوان پر مختلف پیرایہ میں اس قدر پُر اثر اور پُر زور بحث کی ہے کہ یہ نظریہ خاص ان کا ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ان کی ساری تعلیمات کا محور یہی نظریہ ہے۔علامہ اقبالؒ نے لفظ "خودی" کو کسی بھی جگہ غرور و تکبر کے معنوں میں استعمال نہیں کیا۔اسرارِ خودی کے دیباچہ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہاں لفظ "خودی" کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں ہوا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے" ۔اسی طرح قاضی نذیر احمد کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "......اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔اگر ان دونوں میں یا (میری) کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجئے گا......" ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں:

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز بھی ہو تو بے لذتِ نیاز نہیں

خودی کے ماخذات میں سے سب سے پہلا ماخذ قرآن پاک ہے۔اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کافی شہادتیں پیش کی ہیں۔وہ لکھتے ہیں "قرآنِ مجید اپنے سادہ اور بلیغ انداز میں انسان کی انفرادیت اور یکتائی پر زور دیتا ہے اور انسان کی یہی انفرادیت اور یکتائی ہے کہ ایک فرد کے لئے دوسرے فرد کا بوجھ اٹھانا ناممکن ہوجاتا ہے......" ایک فرد پر صرف اسی قدر بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔جس کو اس نے صرف اپنی ذاتی کوشش سے کسب کیا ہے۔انسان ایک آزاد شخصیت کا مالک ہے۔اس کو اس کی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود زمین پر اپنا نائب مقرر کیا ہے۔انسان خدا کا منتخب کیا ہوا ہے۔اس سے صاف طور پر عیاں ہے کہ علامہ کی خودی کا ماخذ خود قرآن ہے اور جب انسان کا یہ مرتبہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ایک ایسے قطرہ سے تشبیہ دی جائے جو انجام کار دریا میں جاکر فنا ہوجائے،بلکہ انسان کی ہستی خدا کی ہستی سے بالکل جداگانہ ہے۔

خودی کا دوسرا ماخذ حدیث شریف ہے۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ "جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے بیشک اپنے خدا کو پہچان لیا"۔گویا خدا کی معرفت نفس یعنی خودی کی معرفت پر موقوف ہے۔اگر خودی کا وجود نہ ہوتا تو خدا کی معرفت کا انحصار اس پر کیسے ہوتا؟ اس لئے اقبال فرماتے ہیں:

خودی را حق بدان، باطل مپندار
خودی را کشت بی حاصل مپندار

خودی کا تیسرا اہم ماخذ مثنوی مولانا رومؔ ہے قرآن پاک اور حدیث پاک کے بعد اقبالؒ "اگر کسی چیز کو کوئی خاص اہمیت اور مقام دیتے ہیں تو وہ مثنوی معنوی ہے۔جس کو "قرآن در زبانِ پہلوی" کہا گیا ہے۔اسرارِ خودی میں فلسفۂ خودی کو پیش کرنے سے قبل علامہ اقبالؒ نے تمہید میں نہایت واضح

الفاظ میں اس بات کا اعتراف واقرار کیا ہے کہ خودی کا فلسفہ مولانا جلال الدین رومیؒ کے فیض سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

باز بر خوانم ز فیض پیر روم
دفتر سر بستہ اسرار علوم

جان او از شعلہ ہا سرمایہ دار
من فروغ یک نفس مثل شرار

خودی کا چوتھا ماخذ مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ عبدیت ہے۔ مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ عبدیت سے انسانی خودی کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ علامہ اقبالؒ ان کے اس نظریہ سے متاثر ہوئے تھے۔ اس تاثر کی بنا پر وہ ان کی طرف اشارہ کر کے خدا تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

علاوہ ازیں! علامہ اقبالؒ نے گو کہ گوشہ نشین اور راہبانہ زندگی گزارنے والے عام صوفیاء کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا لیکن اس بات کے کافی وشافی شواہد موجود ہیں کہ علامہ اقبالؒ کا پیش کردہ فلسفہ خودی بیشتر بزرگانِ دین، مسلمان صوفیائے کرامؒ اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے بھی ماخوذ ہے۔

خودی کو آسان لفظوں میں آپ تمام پیش آمدہ رکاوٹوں اور مشکلات سے عہدہ برآ ہو کر پھر سے ابھرنے اور جذب و تسخیر کی قوت پیدا کرنے کا نام بھی دے سکتے ہیں اور اس کی حقیقی بصیرت کے حصول کا واحد ذریعہ ادراکِ کائنات اور ادراکِ ذات کے بغیر ناممکن ہے۔ جو انسان میں ودیعت ہے......زندگی مسلسل حرکت کا نام ہے جو نت نئی خواہشات کو جنم دیتی ہے اور یہ پیہم عمل اور کشمکش سے لازوال ہو جاتی ہے۔ خودی یا ذات کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ فطرت ہے۔ جس پر غلبہ پایا

بے حد ضروری ہے۔ اقبالؒ کے ہاں اس کی ایک جھلک یوں ملتی ہے:

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن تیرے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اقبالؒ نے خودی کے تین مراحل بتائے ہیں، اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔ انسان کی تخلیق کی غرض و غائت یقیناً نیابتِ الٰہی میں مضمر ہے۔ لیکن یہ منزل اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنی ذات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن جائے۔ انسانی خودی ایک بحرِ بے کنار کی مانند ہے، اس کی وسعتیں اور گہرائیاں اتنی ہیں جتنی انسان کی ہمت اور خود اس کی۔ خودی کی پرورش انسان کو نت نئے انقلابات سے آشنا کرتی ہے۔ اس لئے خودی کو انسان کی زندگی کا ایک لازمی جزو اور آبرو کہا گیا ہے۔ اقبالؒ انسان کو خودی کے جملہ اسرار و رموز بتانے کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ داری بھی دیتے ہیں کہ اس نظریے کی اساس کو پا جانے کے بعد اس کی تبلیغ و ترجمانی بھی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اقبالؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پہ عیاں ہو جا

خودی کا راز داں ہو جا، خودی کا ترجماں ہو جا

اقبالؒ نے جہاں اسرارِ خودی میں انفرادی زندگی کے حقائق بیان کیے ہیں اور اس کی نشو ونما اور استحکام کے رہنما اصول بیان کیے ہیں وہاں رموزِ بے خودی میں افرادِ ملت کے باہمی تعلقات اور ارتباط پر بھی زور دیا ہے۔ اقبالؒ جہاں زندگی کی حفاظت کا درس دیتے ہیں وہاں یہ بھی تاکید کرتے ہیں کہ بوقتِ ضرورت اجتماعی مفادات کے لئے جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اقبالؒ خودی کی موت کے ہرگز خواہاں نہیں کیونکہ فطرت لہو ترنگ ہے جل ترنگ ہرگز نہیں۔ اقبالؒ اس بات کے قائل ہیں کہ خودی پر ہر حال اور ہر قیمت پر قائم رہنا چاہیے اور اس سلسلے میں ابریشم سے اگر فولاد بھی ہونا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں، یہ جائز اور اصولاً درست ہوگا فرماتے ہیں:

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر پھر جھپٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اگر خودی میں ملت کا مفاد جانے کا خدشہ ہو تو بے خودی کے جذبے سے سرشار ہو کر جان کو ملت کی آن پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ خودی کو ایک ایسا سرچشمہ خیال کرتے ہیں جس سے بے خودی کے دریا نکل کر کائنات کو سیراب کر رہے ہیں۔ گویا خودی تو اک جہان ہے اور "میں" یا "انا" کچھ بھی نہیں۔ کیا خوب فرماتے ہیں:

ھستی و نیستی از دیدن و نادیدن من

چہ زماں و چہ مکاں شوخیِ افکار من است

جب خودی بیدار ہوتی ہے تو فہم و شعور کا باعث ہے اور شعور کو قائم رکھنے کا ذریعہ تغیرات ہیں جو بیرونی دنیا میں سے رونما ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بےخودی کو خودی اور خودی کو بےخودی وضع کرتی ہے تا کہ یکسانیت کا ماحول بے شعوری کی کیفیت طاری نہ کر دے۔ خودی کا تقاضا ہے کہ ہر لحظہ نمود و ظہور کا

سلسلہ جاری رہے۔ نئے نئے مقاصد معرضِ وجود میں آتے رہیں اور خودی عشق کو سالاری کا فرض سونپتی رہے، جو اپنا لاؤ لشکر لے کر فطرت کے نگار خانے پر دھاوا بول دیتا ہے اور بالآخر اسے فتح کر کے خودی کی مملکت میں شامل کر دیتا ہے۔ لیکن اقبالؒ نے یہاں ایک حد مقرر کر دی ہے:

اس گلستان میں نہیں حد سے گزرنا اچھا

ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

خودی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے گوناگوں تجربات سے اپنے آپ کو مستحکم کرتی ہے اور پیہم سفر جاری رکھتی ہے۔ اس کو منزل کی تلاش و جستجو رہتی ہے جو اس کہیں بھی قیام و قرار کرنے کے بجائے اس سے آگے ہی آگے نکل کر تلاشِ منزل کا پیامِ مسلسل دیتی ہے۔ غرض خودی کی تخلیق و تکمیل کا سفر جاری رہتا ہے۔ جب ایک مقام پر پہنچ کر ذرا دم لے لیتی ہے تو آگے بڑھتی ہے اور نئی منزل کی تلاش و جستجو کی کسک اسے بے چین کر دیتی ہے اور کوئی مقام اس کے لئے انتہائے راہ یا انتہائے سفر کا حکم نہیں رکھتا۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز

ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

اقبالؒ کی نظر میں حقائق کی دنیا خودی کی منزلِ اولین ہے اور اسے مزید سفر کرنا ہے۔ اسے اقبالؒ سراپا مسافر اور حرکت پذیر دیکھنے کے متمنی ہیں تاکہ جب حقائق کی دُنیا سے نکل کر اور طلسمِ زمان و مکاں کی حدود کو پھلانگ کر، وہ ضمیرِ وجود سے آگے نکلے تو اسے کئی اور عالم نظر آئیں جو بظاہر بے نمود ہیں لیکن جن کے موجود ہونے کے وسیع اور روشن امکانات ہیں۔ اسی لئے ہی تو اقبالؒ تلقین کرتے ہیں:

خودی کے نگہبان کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرو فالِ محمود سے در گزر
خودی کو نگہ میں رکھ ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پہ حرام
یہ عالم یہ ہنگامہء رنگ و صوت
یہ عالم ہے کہ زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بتخانہء چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ منزلِ اولیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تیری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیر مولا، جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید

ہر اک منظر تیری یلغار کا
تیری شوخی فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتح عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تیری سر نوشت
حقیقت یہ ہے جامہ حرف تنگ!
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ!

علامہ اقبالؒ اسرار خودی میں بیان کرتے ہیں کہ زندگی اتنی ہی مضبوط استوار ہوگی جتنا کہ خودی میں زور اور استحکام ہوگا۔۔۔۔۔اقبالؒ نے نہایت دلآویز مثالیں وضاحت سے پیش کی ہیں:

شمع ہم خود را بخود زنجیر کرد
خویش را از ذرہ ہا تعمیر کرد
خود گدازی پیشہ کرد از خود رمید
ہمچو اشک آخر ز چشم خود چکید
گر بفطرت پختہ تر بودے نگین
از جراحت ہا بیاسودے نگین
ے شود سرمایہ دار نام غیر
دوش او مجروح با ز نام غیر
چوں زمین بر ہستی خود محکم است
ماہ پابند طواف پیہم است

ہستیء مہر از زمیں محکم تر است
پس زمیں مسحور چشم خاور است

علامہ اقبالؒ اس نظریے کی تبلیغ واشاعت سے یہ چاہتے ہیں کہ انسان غیر اللہ سے نہ ڈرے۔نہ ہی کسی کے سامنے جھکے،اپنا حق لے اور دوسروں کا حق پہچانے۔۔۔۔اطاعت کوش ہو،فرمان برداری اس کی گھٹی میں پڑی ہو۔۔۔۔دُنیا،عقبیٰ اور جان کا خوف نہ رکھے۔۔۔۔مال وجاہ،وطن اور قومیت کی آلائشوں سے پاک ہو۔۔۔۔ان جملہ خیالات کو وضاحت کے ساتھ اسرارِ خودی میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل باعث طوالت ہوگی البتہ جو نقشہ اقبالؒ نے مردانِ خدا کا کھینچا ہے یہاں اسے پیش کئے بنا بات مکمل نہیں ہوگی۔اقبالؒ نے دُنیا کے لئے کیا رحمت طلب کی ہے فرماتے ہیں:

اے سوار شہب دوراں بیا
اے فروغ دیدہء امکاں! بیا
رونق ھنگامہ ایجاد شو
در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمہ خود را بہشت گوش کن
خیز و قانون اخوت ساز دہ
جام صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجویاں را بدہ پیغام صلح
نوع انسان مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

علامہ اقبالؒ اپنے اس نظریۂ خودی کی بدولت اور اس کے فروغ سے ایک ایسا مردِ مومن تراش کر پیش کرنے کے آرزومند تھے کہ جو ایک نعرۂ مستانہ سے اعدا کو للکار کر یہ دعویٰ کر سکے:

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں، کیا مہر و ماہ، کیا آسمانِ تو بتو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

باب پنجم

علامہ اقبالؒ اور نظریہ یقین

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا

بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی اہلِ ایمان کا ذکر ہوا ہے وہاں ایمان سے مراد "یقین" اور "قلبی تصدیق" ہی ہے۔ ایمان یہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، رسولوں پر، کتب سماوی پر اور روزِ جزا و سزا پر کامل یقین رکھے اور ایمان لائے۔ یہی وہ بنیادی پانچ ارکان ہیں جن پر اسلامی زندگی کی تعمیر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے حضور اور روزِ آخرت وہی شخص سرفراز و سربلند رہے گا جس کا ان پانچ بنیادی حقائق پر ایمانِ راسخ اور یقینِ محکم ہوگا۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یا ایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم۔

(ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت سی بدگمانیوں اور شبہات سے بچے رہو، کیونکہ بعض بدگمانیاں سراسر گناہ ہیں)

ایک دوسری جگہ ارشادِ ربانی ہے:

الحق من ربک فلا تکونن من الممترین۔

(ترجمہ: حق بات وہی ہے جو تیرا ربّ فرمائے، پس تو (حق و صداقت پر) شک کرنے والوں میں مت شریک ہو)

کشف المحجوب میں ہے"یقین خاتم الاحوال ہے"۔اصطلاحِ تصوف میں اس کا مطلب کسی بھی شئے کو ایمان کی قوت سے دیکھ لینا ہے، نہ کہ حجت و دلیل سے اس کے وجود کا اقرار کرنا۔گویا یقین ایمان کی انتہائی شکل ہے۔یہ وہ حال ہے جس میں ایک مردِ مومن اپنے اندر شکوک و شبہات کی اپنے عمل سے نفی کرتا ہے اور اس نفی کے جذبے کو اپنے اندر موجزن پاتا ہے۔یقین کے تین مدارج ہیں:۔

الف۔ علم الیقین: پہلا درجہ علم الیقین ہے۔جس کا مطلب دنیاوی معاملات کو ان کے احکام کے ساتھ جاننا ہے۔

ب۔ عین الیقین: دوسرا درجہ عین الیقین ہے۔جس کا مطلب حالتِ نزع اور وقتِ رحلت کا علم جاننا ہے۔

ج۔ حق الیقین: تیسرا درجہ حق الیقین ہے۔جس کا مطلب جنت میں دیدارِ الٰہی سے اور اس کے احوال و کیفیات کو دیکھ لینے کا ہے۔

مولانا قاضی سجاد حسین لکھتے ہیں کہ "علم الیقین" وہ علم ہے جو کسی سچے خبر دینے والے کی خبر سے حاصل ہو جیسے سچے انسان کے کہنے سے آگ جلانے کا علم اور "عین الیقین" وہ علم ہے جو خود اپنی آنکھ سے دیکھنے سے حاصل ہو مثلاً آگ جلانے کا علم جبکہ آگ سے کسی چیز کو جلتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور "حق الیقین" وہ علم ہے جو اپنی ذات پر تجربہ کرنے سے حاصل ہو جیسے آگ کے جلانے کا علم جبکہ خود آگ نے اُسے جلایا ہو۔

سید علی ہجویریؒ ان مدارج پر فائز مومنین کے درجات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"علم الیقین عالموں کا درجہ ہے، عین الیقین عارفوں کا درجہ ہے اور حق الیقین محبانِ حق کی فنا کا درجہ ہے۔لہٰذا علم الیقین مجاہدہ، عین الیقین محبتِ الٰہی اور حق الیقین مشاہدہ حق سے حاصل ہوتا ہے۔ ان میں اول عام، دوئم خاص اور سوئم ...... خاص الخاص ہے"

شک، ظن وتخمین اور تذبذب یقین کے متضاد ہیں۔ایک مسلمان جب شک وشبہ کی مذمت کرتے ہوئے توحید ورسالت کی قلبی تصدیق کرتا ہے اور احکامات خداوندی کی پیروی کرتے ہوئے خدا شناسی (عرفانِ حق) اور خود شناسی (عرفانِ ذات یا نفس) کی نعمت کو پالیتا ہے اور یہ یقین کرلیتا ہے کہ اس میں "خلیفۃ الارض" بننے اور "نیابتِ الٰہی" کے فرض کو بجالانے کی ہمت پیدا ہوسکتی ہے تو وہ اپنے اندر صفاتِ خداوندی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اسی کوشش کے نتیجے میں اس کے عمل کا دائرہ محدود سے لامحدود ہوجاتا ہے۔پھر یقین کی کرامات اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے لئے مشعلِ راہ بن جاتی ہیں۔جب وہ دولتِ ایمان اور ثروتِ یقین سے فیض یاب ہوجاتا ہے تو اس کے ذوقِ عمل کی سرحدیں حدود وقیود سے آزاد ہوجاتی ہیں۔وہ غیر اللہ اور طاغوت سے خوف زدہ ہوکر زندگی سے بیزاری ظاہر نہیں کرتا اور نومیدی اور بےزاری اس کے رگ وپے میں سرایت نہیں کرسکتی۔وہ نامساعد حالات میں بھی خالقِ کائنات کی مدد اور مشکل کشائی پر یقینِ کامل رکھتا ہے۔اس کا ایمان راسخ ہر قدم پر اس کی گواہی دیتا ہے کہ قادرِ مطلق اور مالکِ حقیقی کی مرضی اور رضا کے تابع رہ کر ہر مشکل سے نجات اور ہر پریشانی سے چھٹکارا پاسکتا ہے۔چنانچہ وہ بڑی مطمئن اور پُرسکون زندگی بسر کرتا ہے۔صاحبِ ایمان ویقین کبھی بھی ناکامی اور حزن وملال سے دوچار نہیں ہوتا۔اسے وسوسوں اور بےجا خدشات سے کبھی بھی واسطہ نہیں پڑتا۔

اس کے برعکس جو انسان شک، تذبذب اور بےیقینی کا شکار رہتا ہے، نفسی تضادات کو دور نہیں کرتا اور اپنے مقامِ ارفع اور منصب عالی کی پروا نہیں کرتا تو وہ بےیقینی اور شک کی بدولت کبھی بھی اپنی منزل نہیں پاسکتا اور وہ اپنے ارادوں اور منصوبوں پر کبھی بھی پورا نہیں اتر سکتا کیونکہ بےیقینی اور شک وشبہ کی بدولت وہ کسی منطقی فیصلے تک جا ہی نہیں سکتا۔اس کے ارادے اور نظریے کبھی بھی اپنے نقطۂ عروج کو نہیں پہنچ سکتے اور عملی زندگی میں وہ محض ایک اکائی یا ناکارہ وجود ہی سمجھا جائے گا۔

علامہ اقبالؒ ایک سچے، بیباک اور نڈر مردِ مسلمان تھے اور امتِ مسلمہ کو بھی اسلام کی روش پر گامزن دیکھنے کے آرزومند تھے۔ لہٰذا ان کے ہاں ایمان و یقین اور اسلامی اصولوں کو اپنانے کی تلقین بالکل فطری امر ہے۔ اقبالؒ نے جو یقین کا درس دیا ہے یہ درحقیقت خداشناسی اور خودشناسی ہی کا دوسرا نام ہے اور خودشناسی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مادی لذات کا تابع نہ رہے۔ ان کا یہ درس کلامِ الٰہی کی اس تعلیم پر موقوف ہے کہ انسان ہی خلاصۂ کائنات اور مقصدِ تخلیقِ کائنات ہے لیکن وہ اپنے مقام و مرتبہ اور فرائض کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ اقبالؒ کا خیال یہ ہے (اور یقیناً یہ خیال درست ہے) کہ اس مردِ حق کا سینہ سوزِ یقین کی دولت سے خالی ہے۔ وہ اس گوہرِ بے بہا سے محروم ہے۔ معرکۂ حیات میں اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یقین وہ لازوال دولت ہے جس تک رسائی کے لئے انبیاؑ اور رسلؑ کو بھی لاہوت و ملکوت کا مشاہدہ کرایا جاتا رہا ہے۔ قرآنِ پاک منزلِ یقین کے باب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کائناتی مشاہدے کی نسبت یوں ارشاد فرماتا ہے:

وکذالک نری ابراھیم ملکوت السموٰتِ والارض ولیکون من العوقنین۔

(ترجمہ: ہم نے (ابراہیمؑ) کو زمین و آسمان کی بادشاہتوں کا مشاہدہ اس لئے کرایا کہ وہ صاحبِ یقین ہو سکیں)

حضرت ابراہیم علیہ السلام یقین کی اس منزل پر فائز کیے گئے جو اقبالؒ کے نزدیک عشق کا دوسرا زینہ ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے وجودِ ابراہیم علیہ السلام کو خود عشق سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ایک اور مقام پر علامہ اقبالؒ عقل اور عشق کا موازنہ کرتے ہوئے عقل کو شک کا آئینہ دار قرار دیتے ہیں اور عشق کو یقین کا عکاس کہتے ہیں:

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقین لاینفک است

قرآنِ پاک اس تصور پر ان الفاظ میں مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے:

واعبد ربک حتی یاتیک الیقین

(ترجمہ: اپنے رب کی ایسی بندگی کرو کہ تمہیں منزل کا یقین ہو جائے)

اقبالؒ کے نزدیک یقین اس باطنی اور ذہنی کیفیت کا نام ہے جو محال کو ممکن اور ناممکن کو واقع بنا دیتی ہے۔ یقین ہی وہ دولت ہے جو مردِ مومن کے لئے خود تقدیرِ الٰہی بن جاتی ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

علامہ اقبالؒ اسی جذبۂ یقین کی بدولت نئی تقدیر رقم کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور پرانی تقدیر کو بدل ڈالنے کا ایک اہم نسخہ اور وسیلہ اسی ذوقِ یقین کی قوت کو قرار دیتے ہیں۔ اس کے لئے صرف مردِ مومن اور صاحبِ یقین ہونا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن، مومن را ممکن است

ظاہر ہے کہ یقین کی اس کیفیت میں زندگی کے ہر قدم پر کامیابی و کامرانی کی ضمانت کا پایا جانا بے حد ضروری ہے اور اس بات کی ضمانت خود خداوند تعالیٰ قرآنِ پاک میں فراہم کرتے ہیں کہ تم صاحبِ یقین ہو جاؤ اور ہر قسم کی پریشانی، پشیمانی اور گھبراہٹ، خوف یا ڈر سے چھٹکارا حاصل کر کے

صرف اور صرف میرے بندے اور عبادت گزار بن جاؤ تو دُنیا کے کسی بھی معرکے میں، کسی بھی میدان میں تم ہمیشہ باطل پر غالب آؤ گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لاتھنوا ولا تحزنو انتم الاعلون ان کنتم مومنین

(ترجمہ: پست ہمت نہ ہوا اور نہ ہی گھبرا، تم ہی غالب ہو کر رہو گے، بشرطیکہ تم صاحبِ ایمان (یعنی اہلِ یقین) ہو جاؤ۔)

بانگِ درا کی ایک نظم میں علامہ اقبالؒ مردِ مومن کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی پوشیدہ صلاحیتوں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے مراتب کے بارے میں کس قدر زوردار مگر حقیقت اور یقین سے لبریز الفاظ میں فرماتے ہیں:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر کے بغیر
تیری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
تیری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

علامہ اقبالؒ صاحب یقین کو ہر دم آگے ہی آگے، منزلِ شوق کی جانب دیوانہ وار بڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ حیات کو متحرک اور فعال دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ وہ صاحب یقین کو تسخیر کائنات پر اکساتے ہیں اور یہی اقبالؒ کا اعجاز ہے۔ اقبالؒ مردِ یقین کو کسی بھی مقام پر قناعت کرنے یا ستانے کی چھوٹ نہیں دیتے بلکہ اسے ذوقِ عمل اور مسلسل محوِ سفر یا حرکت پذیر دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی زندگی کا تقاضا بھی ہے۔ ورنہ کسی ایک مقام پر رکنے یا قیام کرنے سے انسان کی باطنی صلاحیتیں اس آرام طلبی کے طفیل مردہ ہو کر اس کے قلب ونگاہ سے دوری حاصل کر لیتی ہیں۔ صاحب یقین کو اقبالؒ نے مستقبل پر نگاہ رکھ کر منزلِ حقیقی کی جانب یوں روانہ کیا ہے فرماتے ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی ہیں آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو دیا نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا

کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

بے یقین انسان میں حق وصداقت کی تحقیق اور افکار نو تک رسائی نیز نت نئے افکار اور تخلیقات وایجادات سے متعلق فکری وتخلیقی سطح پر کام کرنا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ بے یقین انسان اپنے اندر شک وظن کے طفیل آنے والے خیالات اور افکار کو کبھی بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ اس کے دل میں نئے نئے فکری اور تخلیقی نقش نہیں ابھرتے اور وہ اپنے وجود اور ضمیر کے اندر پرورش پانے والے شک کے مادے کی بدولت کسی نتیجہ خیز انجام تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنی تخلیقی اور فکری صلاحیتوں کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

بی یقین را لذت تحقیق نیست

بی یقین را قوت تخلیق نیست

بے یقین را رعشہ ہا اندر دل است

نقش نو آوردن او را مشکل است

علامہ اقبالؒ انسان کی باطنی راہنمائی کے لئے جوہرِ یقین کو ایک روشن شمع یا قندیل قرار دیتے ہیں جس سے انسان ظلمت کے مقابلے میں روشنی لیتا رہتا ہے کہ حیات کے اس ظلمت آگیں سفر میں قندیلِ روشن جلا کر اپنی منزل تک بآسانی پہنچ سکے۔ فرماتے ہیں:

گماں آباد ہستی میں یقین مردِ مسلماں کا

بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

مولانا سید ابوالحسن ندوی "نقوشِ اقبالؒ" میں "اقبالؒ کی شخصیت کے تخلیقی عناصر" کے تحت لکھتے ہیں۔ "...... پہلا عنصر جو اقبالؒ کو اپنے داخلی مدرسہ میں داخلہ کے بعد اول ہی دن سے حاصل ہوا وہ اس کا "ایمان ویقین" ہے۔ یہی یقین اقبالؒ کا سب سے پہلا مربی ومرشد ہے اور یہی اس کی طاقت وقوت اور حکمت وفراست کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ لیکن اقبالؒ کا وہ یقین وایمان اس خشک وجامد ایمان کی

طرح نہیں ہے جو بے جان تصدق یا محض جامد عقیدہ ہے بلکہ اقبالؒ کا یقین، عقیدہ و محبت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو اس کے قلب و وجدان، اس کی عقل و فکر، اس کے کار و تصرف، اس کی دوستی و دشمنی غرضیکہ اس کی ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں نہایت راسخ الایمان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی محبت و شفقت اور ان کا اخلاص انتہا درجہ کا تھا۔ اس لئے ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندہ جاوید دین ہے کہ اس کے بغیر انسانیت مدارج و سعادت کے بامِ عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی اور نبی پاک ﷺ رشد و ہدایت کے آخری مینار، نبوت و رسالت ﷺ کے خاتم اور مولائے کل ہیں:

وہ دانائے سبلؐ ختم الرسلؐ مولائے کلؐ جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیء سینا

دراصل علامہ اقبالؒ کا یہی وہ ایمانِ کامل اور حبِ صادق تھی جس نے اقبالؒ کے کلام میں یہ جوش، یہ ولولہ، یہ سوز و گداز پیدا کردیا۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ دراصل رقت انگیز شعر، عمیق فکر، روشن حکمت، بلند معنویت، نمایاں شجاعت، نادر شخصیت اور عبقریت (GENIUS) کا حقیقی منبع و سرچشمہ محبت و یقین ہی ہے اور تاریخِ عالم میں جو کچھ بھی انسانی کمالات یا دائمی آثار و نشانات نظر آتے ہیں وہ سب کے سب اسی محبت و یقین کے مرہونِ منت ہیں۔ اگر کوئی شخصیت یقین و محبت سے خالی ہو تو پھر وہ صرف گوشت پوست کی صورت ہے اور اگر پوری امت اس سے خالی ہے تو پھر اس کی وقعت بکریوں اور بھیڑوں کے گلے سے زیادہ نہیں اور اس طرح اگر کسی کلام میں یقین و محبت کی روح کارفرما نہیں ہے تو پھر وہ ایک مقفیٰ اور موزوں کلام تو ہو سکتا ہے لیکن ایک زندہ جاوید کلام نہیں بن سکتا۔ جب کوئی کتاب اس روح سے خالی ہو تو اس کتاب کی حیثیت مجموعہ اوراق سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی اور اس طرح اگر کسی عبارت میں محبت و یقین کا جذبہ شامل نہیں ہے تو پھر وہ ایک بے روح ڈھانچہ ہے۔ غرضیکہ پوری زندگی اگر محبت و یقین سے خالی ہے تو پھر وہ زندگی نہیں بلکہ موت

ہے۔اور پھر ایسی زندگی کیا؟ جس میں طبیعتیں مردہ وافسردہ ہوں......نظم ونثر کے سرچشمے خشک ہوں اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہوں......ایسی حالت میں یقینِ کامل اور حبِ صادق ہی حیاتِ انسانی یا زندگی کو نور و رنگ سے معمور کر سکتی ہے۔ پھر شستہ، پردرد، پر سوز، روح پرور اور جان بخش کلام سننے میں آتے ہیں۔ خارق عادات اور شجاعت و قوت دیکھنے میں آتی ہے اور علم وادب کے نقوش بھی زندہ جاوید بن جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہی جذبہ اگر پانی، مٹی اور اینٹ، پتھر میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔ ہمارے سامنے اس کی روشن مثال مسجدِ قرطبہ، قصرِ زہرا اور تاج محل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت و یقین کے بغیر ادب و فن مردہ وافسردہ و ناتمام ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

علامہ اقبالؒ کی نظر میں جہاں یقین عین ایمان ہے اور وہ اس کے تحفظ و بقا کی تلقین کرتے ہیں وہاں وہ شک کو عین کفر سمجھتے ہیں اور اس کی تردید و مذمت بھی کرتے ہیں، نیز اس سے گریزاں رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ شک یا گمان انسان کے وجود میں ایک ایسے اژدھے کا کردار ادا کرتا ہے جس کے ڈسنے سے انسان آناً فاناً ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بے یقینی یا شک و گمان بھی انسان کے وجود کی عمارت کو زمین بوس کر دیتا ہے۔ شک کی وجہ سے قلب و نظر میں جو فساد پیدا ہوتا ہے اس کا علاج بھی یقینِ محکم ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ اقبالؒ خوف سے نجات کے لئے ایمان اور شک و گمان سے بچاؤ کے لئے ایمان و یقینِ کامل کی تلقین کرتے ہیں۔ جو ایک ایسی ناقابلِ تسخیر قوت ہے جو کائنات میں آزادی سے معروفِ کار رہتی ہے اور یہ ایک ایسی طاقت ہے کہ جس سے بغیر کسی عملی جنگ و جدل کے بغیر بھی انسان کائنات کی تمام بادشاہتیں حاصل کر سکتا ہے اور اگر اس قوت کا ادراک کرنے کی بصیرت عطا ہو جائے تو وہ تمام دنیاوی بادشاہتوں کا مالک و مختار بن جاتا ہے۔ اسی قوت و طاقت کو اقبالؒ نے انسان کی پوشیدہ صلاحیت کا نام دیا ہے۔

باب ششم

علامہ اقبالؒ اور نظریہ فقروغنا

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
اک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

علامہ اقبالؒ صوفیانہ مذاق رکھنے اور غیر معمولی دل و دماغ کی بدولت علم تصوف کے مطالعہ سے بے نیاز نہیں تھے بلکہ انہوں نے خود بھی صوفیانہ روش اختیار کیے رکھی۔ چونکہ صوفی لوگ اپنے اندر دانش اور علوم کے وافر ذخائر رکھتے ہیں اور اقبال جیسی ہمہ جہت شخصیت میں بھی ایسے علوم کے لامحدود ذخائر تھے۔ وہ فلسفہ و منطق، ریاضی و قانون، تاریخ و سیر، تصوف، اسلامی دستورِ حیات اور ان سے متعلق تمام علوم کے ماہر تھے۔ شاعری کو انہوں نے اپنے فکر اور فلسفہ کو عوام و خواص تک پہنچانے کا ذریعہ و وسیلہ بنایا......اور اس میں بلاشبہ کامیاب و کامران بھی ہوئے......انہوں نے اسلامی تصوف پر اپنے افکار و خیالات، نظریات، مشاہدات اور تجرباتی پیغامات کے ذریعے اس میں بیداری کا ایک نیا اور اچھوتا انداز اپنایا اور خانقاہی نظام بالخصوص گوشہ نشین نام نہاد صوفیوں کو راہبانہ طرزِ زندگی سے دستکش ہونے کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ ان کے اس طرزِ حیات پر کڑی تنقید بھی کی۔ انہوں نے اسلامی تصوف کے حقیقی، روحانی اور اصلاحی مقامات کے تعین اور اس کی فروعاتی تشریحات کے بارے میں اپنے کلام و پیام میں جابجا لازوال اور ابدی صداقتوں کے موتی بکھیرے ہیں۔

فقر مقاماتِ تصوف میں چوتھا مقام ہے۔ لغت میں اس کے معنی احتیاج ہیں اور اصطلاحِ تصوف میں اس سے مراد یہ ہے کہ صوفی کا ہاتھ متاعِ دُنیا سے خالی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی اس خواہش سے خالی ہو۔ صوفی اگر دولت نہیں رکھتا اور اس کا دل دولت کا خواہش مند ہے تو وہ فقر کے

مقام تک نہیں پہنچ سکتا...... یعنی فقر کا مطلب محض عدم دولت ہی نہیں بلکہ عدم خواہشِ دولت بھی ہے۔ شیخ ابو عبداللہ خفیفؒ سے مروی ہے "الفقر عدم الاملاک" یعنی فقر عدم ملکیت کا نام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کی نئی تعبیر پیش کی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "فقر سے میری مراد افلاس و تنگدستی نہیں بلکہ استغنا اور دولت سے لاپروائی ہے" اس نقطے پر بالِ جبریل میں فرماتے ہیں:

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

علامہ اقبالؒ اپنے کلام میں فقر کے لئے عموماً جن چار پانچ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان سب سے ایک ہی معنی لیتے ہیں۔ وہ فقر، قلندری، درویشی، بندی اور فقیری ہیں۔ ان کے نزدیک فقر کے لئے ضروری نہیں کہ صاحبِ فقر کارِ جہاں سے یکسر دست بردار ہو کر اور جاہ و دولت سے اپنا دامن بچا کر گوشہ نشین ہو جائے بلکہ صحیح فقر دراصل غنائے نفس کا نام ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں:

در قبائی خسروی درویش زی
دیدہ ء بیدار و خدا اندیش زی
اقبال قبا پوشد، در کارِ جہاں کوشد
دریاب کہ درویش با دلق و کلاہی نیست

اقبال فقر اور رہبانیت کو متضاد بلکہ ایک دوسرے کی واضح ضد سمجھتے تھے اور اثباتِ فقر کے نظریہ کے طور پر مقاماتِ فقر کے بھی زبردست داعی اور علمبردار تھے۔ دُنیاوی جاہ و حشم کو فقر کے ہونے سے ہی دیرپا سمجھتے تھے۔ اگر فقر نہیں تو دُنیاوی سلطانی اور سلیمانی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتے بلکہ جو صفتِ فقر سے تہی ہے وہ سلطانی اور سلیمانی سے بھی محروم ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تیری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

سکوں پرستیِ راہب سے فقر ہے بیزار
فقر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
نہ رہی دولتِ سلمانی و سلیمانی

اقبالؒ تو قلندری میں سکندری کرنے کے آرزومند ہیں۔ وہ تو فقیر کو اس مقام پر دیکھنے کے متمنی ہے جہاں قلندر، سکندر سے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز نظر آتا ہے......جہاں سکندر قلندر کی بارگاہ میں باریابی کے لئے تاجِ شہی کو خاک آلودہ کرنے پر آمادہ ہو......چنانچہ فرماتے ہیں:

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے؟
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے؟

اقبالؒ جب نام نہاد فقیروں کو بڑے بڑے شاہانِ وقت کے درباروں پر جبینِ نیاز جھکائے دیکھتا ہے تو اس کے اندر کا قلندر......اپنے باطن میں اضطراب و پریشانی کے باعث ایک قسم کی ہلچل کا باعث بنتا ہے......اقبالؒ نے نام نہاد فقیری کی اس حرکتِ حقیر پر کچھ ان الفاظ میں سرزنش کی ہے:

آہ! کھو گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر سلطنتِ روم و شام

فقیر یا قلندر کے لئے کسی بھی مخصوص روپ یا لبادے کی شرط نہیں، اگر کوئی شرط ہے تو فقط شریعتِ محمدی ﷺ پر عمل پیرا رہ کر مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا اور انسانیت کی بھلائی کی مسلسل تبلیغ کرتے رہنا ہے۔ علامہ اقبالؒ نام نہاد فقیروں اور قلندروں کو اپنی مثال پیش کرتے ہیں کہ آؤ میں اگرچہ ظاہری وضع قطع میں تم جیسا نہیں لیکن میرے پاس تمہیں بتانے کے لئے بہت کچھ ہے فرماتے ہیں:

بیا بمجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد، قلندری داند

اقبالؒ خود اپنے آپ کو فقیر، قلندر، درویش اور رند کہتے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس صفت کو پسند کیا ہے اور خود بھی اسے اختیار کر کے دُنیا کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کی حیات کا بالاستعیاب مطالعہ کرنے سے اُن کے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ وہ خود بھی ایک فقیرِ راہ نشین تھا اور قلندر بھی......انہوں نے زندگی بھر دولت کی پرواہ کی نہ جاہ و ثروت کی بلکہ اپنی پوری زندگی سادہ طریقے سے گزاری۔ امیرانہ شان و شوکت کا کبھی خیال نہ آیا اور نہ ہی کبھی دولت کی حرص و طمع کا شکار ہوئے......ذیل کے اشعار ان کی قلبی واردات کا صحیح نمونہ پیش کرتے ہیں:

من فقیرِ بے نیازم، مشربم این ست و بس

مومیائی خواستن نتواں، شکستن من تواں

ناز شہاں نمی کشم، زخم کرم نمی خورم

در نگر ای ہوس فریب، ہمت ایں گدائی را

نہ شیخ شہر، نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبالؔ

فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد

یہ قانونِ قدرت ہے کہ پدری وراثت سے ملنے والی قدروں کی حفاظت نہ کی جائے تو زندگی کے کسی موڑ پر یا آنے والی نسلوں کو اس کوتاہی کی سزا بہر حال ضرور ملتی ہے اور اسے اس زیاں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اقبالؒ جاہ طلب فقیروں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات

جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے

زوالِ بندہ ء مومن بے زری سے نہیں

فقر انسان کی ایک قلبی صفت اور دلی کیفیت کا نام ہے۔ جس کا صحیح مفہوم قرآنِ مجید کی

آیت "یاایھاالناس انتم الفقراء الی اللہ ھو الغنی الحمید" سے ماخوذ ہے۔ حقیقی فقیر صرف اس ذاتِ واحد کی طرف محتاج ہوتا ہے اور اس (اللہ تعالیٰ) کے سوا کسی اور طرف سے اُسے حاجت روائی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ فقر کی اِس صفت سے جو بہرہ ور ہو جاتا ہے اس کی شانِ بے نیازی بہت بلند اور ارفع ہو جاتی ہے اور یہی بے نیازی کی وہ اعلیٰ شان ہے جس سے بندہ ہر شئے کو قدرت کاملہ اور رحمتِ ایزدی کے طفیل اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں:

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر

ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

فقر چوں عریاں شود زیر سپہر

از نہیب او بلرزد ماہ و مہر

آنحضرت ﷺ کے قول "الفقر فخری" (فقر میرا فخر ہے) سے بھی یہی مراد ہے اور اس فخر کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہیے اور نعمت کی اگر خواہش ہے تو بادشاہوں کے بجائے حق تعالیٰ سے مانگنی چاہیے۔ اقبال فرماتے ہیں:

گرچہ باشی از خدا و ندان دہ

فقر را از کف دہ، از کف مدہ

سوز او خوابیدہ در جان تو ہست

ایں کہن مے از نیاگان تو ہست

در جہاں جز درد دل مخواہ

نعمت از حق خواہ و از سلطان مخواہ

یہی فقر دراصل حجازی فقر ہے...... ضرب کلیم میں جاوید اقبال سے مخاطب ہو کر اُس "فقر حجازی" کو تلاش کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور اس فقر کو حاصل کر لینے کے بعد بے تیغ و سناں بندہ مجاہد اور

غازی کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔اقبال فرماتے ہیں:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

"حجازی فقر" اور "رہبانی فقر" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔بالِ جبریل میں انہوں نے "فقر" کے عنوان سے تین شعر کہے ہیں۔جن میں فقر کی مذکورہ دو قسموں کا امتیاز بیان کیا گیا ہے:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبیری، اس میں ہے میری
میراثِ مسلمانی، سرمایہ ء شبیری

اقبالؒ رہبانیت کی مخالفت یا رہبانہ طرز پر زندگی گزارنے والے نام نہاد فقیروں پر تنقید کرتے ہیں تو اس کی توجیح ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

"رہبانیت دُنیا کی ہر مستعد قوم میں اس کے عملی زوال کے وقت پیدا ہوتی ہے......

اس کا مٹانا ناممکن ہے کہ بعض رہبانیت پسند طبائع ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ جو کچھ ہم
کر سکتے ہیں، وہ اس قدر ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کریں اور اس کو رہبانیت
کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔"

علامہ اقبالؒ اس فقر سے گریز کرتے ہیں جو "خودی" کو ضعف پہنچاتا ہے۔ ان کے نزدیک "حجازی فقر" ہی مقبول ہے اور اس فقر کی سان پہ جب تیغِ خودی چڑھتی ہے تو اس کی قوت بے پناہ ہو جاتی ہے:

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
اک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

نیز خودی کے تحفظ کے لئے اقبال جاہ و حشم کو بھی قاتل سمجھتے ہیں...... وہ فقیری ہی میں نام پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے بارہا اپنی مثال پیش کر کے لوگوں کو سلوک و تصوف کے مقاماتِ فقر اور مسائل سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کی ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر
غریبی میں ہوں محسود امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری

اقبالؒ نے قلندری، فقر، درویشی اور فقیری کے موضوع پر اپنے اشعار و افکار میں گوشہ نشین قلندروں کو خانقاہوں سے نکل کر دنیا کو فیض یاب کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فقیر خانقاہوں کے اندر نہیں بلکہ کائنات کی وسعتوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور اسرارِ کائنات سے نقاب کشائی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ باطل کی مخالفت اور حق کی حمایت اس کا حقیقی مشن ہوتا ہے اور فقراء کو فقر و فلسفہ میں وسعت کے لئے غیر سے لاتعلق رہ کر بندگانِ خدا کی صراطِ مستقیم کی جانب رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا ہوتا ہے......

اور انہیں اپنے تمام باطنی اور روحانی مشاہدات اور قلبی واردات میں زمانے کے عظیم اکابرین اور فقراء کو منتقل کرنے کا فرض بھی بطریقِ احسن ادا کرنا ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی فکری آزادی کو رموزِ قلندری سے پردہ اٹھانے کا سبب کہا ہے اور اسی ضرورت کے تحت انہوں نے قلندری کے اسرار و رموز سے نقاب کشائی کی کوشش کی ہے...... اقبالؒ فرماتے ہیں:

کیے ہیں رموزِ قلندری میں نے فاش
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

باب ہفتم

علامہ اقبالؒ اور نظریہ صبر و رضا

از رضا مسلم مثال کوکب است
در رہ ہستی تبسم بر لب است

صبر راہِ سلوک کا پانچواں مقام ہے۔۔۔۔۔صبر وہ ہے کہ جس کے ذریعے انسان تنگی و فراخی میں فرق نہ کرے۔۔۔۔۔صوفیاء کے نزدیک صبر آدھا ایمان ہے۔۔۔۔۔فقر کی تکمیل کے لئے صبر انتہائی ضروری ہے۔ صبر ثابت قدمی کی تعلیم دیتا ہے۔ فقر کو حق گوئی و بے باکی کی بدولت بہت سی مشکلات اور دُنیاوی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کے لئے صبر کا جذبہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔ صابرین کے تین درجے ہیں۔ پہلا متصبر: ایسا شخص کبھی تکالیف و مشکلات پر صبر کر لیتا ہے اور کبھی عاجز آ کر واویلا کرتا ہے۔ دوسرا صابر: جو خدا اور خدا کے واسطے صبر کرے اور اس (رَبُّ العزت) کی رضا کے خلاف کسی قسم کی شکایت نہ کرے۔ اور تیسرا صبار: جس کا صبر خدا میں، خدا کے واسطے اور خدا کے وسیلہ سے ہو۔ ایسے شخص پر تمام دنیا کی مشکلات اور مصائب بیک وقت بھی آ پڑیں تو عاجز نہیں ہوتا اور اس کے دل میں تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ خواجہ حافظ شیرازی مقامِ صبر پر فائز سالک کی رُوحانی رفعت و عظمت کے بارے میں فرماتے ہیں:

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر
آری شود و لیک بخون جگر شود

قرآنِ مجید میں ہے کہ:۔۔۔۔۔ ولنبلونکم بشی من الخوف و الجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرۃ۔

(ترجمہ:اور ہر طریقہ سے ہم تم کو آزمائیں گے، کچھ خوف سے اور بھوک سے اور اموال سے اور جانوں اور میوے کا نقصان پہنچا کر)۔

اور علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

امتحان پاک مرداں از بلا ست
تشنگاں را تشنہ تر کردن روا ست
در گزر مثل کلیم از رودِ نیل
سوئے آتش گام زن مثل خلیل

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ انسان مشکلات برداشت کرے۔۔۔۔اور گھبرائے نہ ہو، شکوہ نہ کرے بلکہ شکر گذاری کا ثبوت دے:

گلہ از سختی ایام بگذار
کہ سختی ناکشیدہ کم عیار است
نمی دانی کہ آب جوئیا راں
اگر بر سنگ غلطد و خوشگوار است

ایک مکتوب میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو تحریر فرماتے ہیں۔۔۔۔"میری صحت بہ نسبت سابق بہتر ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی ایک دائم المریض کی سی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ!۔۔۔۔جب موت آئے گی تو مجھے متبسم پائے گی" میرے خیال میں ایک مومن کو مقامِ صبر کی یہ بھی انتہا ہی ہے کہ وہ موت کا متبسم استقبال کرنے کے لئے اپنے آپ کو اپنے ظاہر و باطن اور اپنے دل و دماغ کو تیار کرے۔

اسی طرح رضا ہے۔ اصطلاحِ تصوف میں رضا سے مراد یہ ہے کہ بندے کا دل حکمِ خداوندی کے مقابلے میں ساکن اور مطمئن رہے۔۔۔۔وہ تقدیر پر ایمان رکھنے کے ساتھ یہ اعتقاد بھی رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کی قسمت متعین فرماتے وقت کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

رضا مومن کا وہ بلند ترین مقام ہے کہ جس سے ماورا اور کوئی مقام نہیں ۔۔۔۔۔ورزشِ اخلاق اور تہذیبِ نفس کا آخری مرحلہ یہی ہے۔اس مقام پر پہنچنے والا شخص ہر صورت میں اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا سے راضی رہتا ہے اور اسے اپنے حق میں خیر و برکت کا موجب تصور کرتا ہے۔اس مقام پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رضا کے تابع ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔اسی بلند ترین مقام پر فائز شخص ہی مرتبۂ رضا کی رفعتوں اور منزلوں کا شناور کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔علامہ اقبالؒ نے ایک شعر میں مقامِ رضا کے حصول کی یوں تعلیم دی ہے:

در رضایش مرضیء حق گم شود
ایں سخن کے باور مردم شود

رضا مقاماتِ سلوک کا ساتواں اور آخری مقام ہے۔اس منزل پر پہنچ کر سالک کی زندگی اور مستحکم ہو جاتی ہے۔علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

زندگی محکم ز تسلیم و رضا ست
موت نیرنج و طلسم و سیما ست

اور اس مقام پر پہنچ کر سالک "مثلِ کوکب" ہو جاتا ہے۔اس کی چمک دمک اور آب و تاب میں نکھار آ جاتا ہے اور اس کی باطنی درخشانی اور جلوہ آرائی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔وہ زندگی کے ہر لمحے اور ہر کیفیت سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور زندگی میں ہر وقت اور ہر کیفیت میں متبسم رہتا ہے۔۔۔۔۔چنانچہ اقبالؒ اسی حقیقت کا یوں اظہار فرماتے ہیں:

از رضا مسلم مثالِ کوکب است
در رہ ہستی تبسم بر لب است

صبر و رضا ایک ایسا مقام ہے جہاں پہنچ کر مومن کی رضا اور مالک و خالقِ ارض و سما کی منشاء و مرضی کا امتیاز تقریباً مٹ جاتا ہے۔بندہ و مالک کی مرضی گویا ایک ہو جاتی ہے۔انسان اپنے خالق و

مالک کی مرضی کے تابع فرمان ہو جاتا ہے تو اللہ رب العزت کی رضا وخوشنودی کی گویا تکمیل کر دیتا ہے اور یوں دونوں کی مرضی ورضا کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ مقامِ رضا سالک کا وہ مقام ہے جس میں وہ مصائب اور ذلت کو مقصود بالذات سمجھ کر برداشت کرتا ہے، صبر سے کام لیتا ہے اور مشکلات پر دامنِ صبر کو نہیں چھوڑتا۔ اوران حالات میں بھی اس کے نفس کی وہی کیفیت رہتی ہے جو خداوند تعالیٰ کی نعمتوں سے فیضیاب اور بہرہ ور ہونے میں ہوتی ہے۔

حضرت رابعہ بصریؒ سے کسی نے اِس مقام کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا "یہ مقام سالک کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ مصیبت میں بھی وہی خوشی محسوس کرے جو اس کو نعمت کے وقت حاصل ہوتی ہے"۔ علامہ اقبالؒ مقامِ رضا پر پہنچنے والے سالک کو مرضیِ حق پر صبر وشکر ادا کرنے کی تلقین کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ گوہر از خود صدف سے باہر آتا ہے...... اسی طرح وہ بھی مالک کی مرضی اور رضا کے تابع رہے، وہ فرماتے ہیں:

در رضائی حق فنا شو چوں سلف
گوہر خود را بروں آر از صدف

اسی بات کو مثنوی "پس چہ باید کرد" میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

چوں فنا اندر رضائی حق شود
بندہ ، مومن فنائی حق شود

مسلکِ صوفیاء میں سالک مقامِ رضا میں اپنی ذات کو کلی طور پر ذاتِ خداوندی میں فنا کر دیتا ہے۔ جبکہ اقبالؒ اس مقام پر اپنی "خودی" کی حفاظت اور نمود پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ مقامِ رضا میں وصل کے بجائے فراق کے طلبگار ہیں تا کہ حیات اور خودی دونوں برقرار رہیں...... اور یہ مرحلہ شوق کبھی طے نہ ہو...... وہ اس (فنا) کے بجائے فراق کی حالت سے لطف اندوز ہونے کے آرزومند ہیں...... فرماتے ہیں:

از فراق است آرزو ہا سینہ تاب
تو نہ دانی چوں شود "او" بی حجاب
از جدائی گرچہ جاں آید بلب
وصل "او" کم جو "رضائی او" طلب
مصطفیؐ داد از رضائی "او" خبر
نیست در احکام دیں چیزی دگر

اس کے باوجود اقبالؒ اپنی زندگی کو احکاماتِ خداوندی کی پیروی میں گزارنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ ہر حال میں ذاتِ باری تعالیٰ کے شکر گذار اور راضی برضا ہیں۔ نہ تو کسی بات پر شکوہ بے نگہ مند ہیں اور نہ ہی زمانے کی سختی یا تنگی پر حرفِ شکایت زباں پر لاتے ہیں، بلکہ اقبال فرماتے ہیں:

تیری بندہ پروری سے میرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

یہ سب پریشانیاں اور تکالیف انسان کو دنیا میں اس لئے بھی دیکھنا پڑتی ہیں تا کہ وہ زندگی کی اس بھٹی میں سے تپ کر کندن بن کر نکلے۔ لہٰذا سالک کو بھی زندگی کی پریشانیوں اور آلام سے ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ایک تمثیل کے ذریعے وہ اس پیغام کی ان الفاظ میں تلقین کرتے ہیں:

مرغے ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید
خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید
بد گفت فطرتِ چمنِ روزگار را
از دردِ خویش و ہم ز غمِ دیگراں تپید
گفت اندریں سرا کہ بنائش فتادہ کج
صبحے کجا کہ چرخ در و شامیانہ چید

سوزِ فغانِ او بہ دلِ ہُد ہُدے گرفت

با نوکِ خویش خار ز اندام او کشید

گفتش کہ سودِ خویش ز جیبِ زیاں برآر

گل از شگافِ سینہ زرِ ناب آفرید

علامہ اقبال تسلیم ورضا کو مردوں کا معرکہ مانتے ہیں۔وہ تسلیم ورضا کو ایک ایسی پوشاک یا قبا کہتے ہیں جو صرف مردانِ صفا کو ہی زیب دیتی ہے۔وہ اس جذبے کو ایک ایسی زینت کہتے ہیں جو صوفیائے خام ......یا حقیقت ناشناس سالکوں کو زیب نہیں دیتی۔اقبال تسلیم ورضا پر قائم سالکوں کو مخصوص گروہ کے نام سے یاد کرتے ہیں جن کی صفات اوراقدار نام نہاد سالکوں یا صوفیاء سے قطعی مختلف ہیں اور جن کا اپنا مخصوص رہن سہن اور رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔اقبال فرماتے ہیں:

کارِ مرداں است تسلیم و رضا

بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا

باب ہشتم

علامہ اقبالؒ اور نظریہء خوف و رجا

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلب او از لا تخف محکم شود

اصطلاحِ تصوف میں آنے والے زمانے میں کسی مکروہ یا ناپسندیدہ امر کے پیش آنے یا کسی مستحسن یا پسندیدہ امر کے چھوٹ جانے کے ڈر کی حالت کو خوف کہا گیا ہے۔۔۔۔۔اور حدیث پاک میں ہے کہ "خدا خوف و رجا کے مابین ہے" اس کی رُو سے صوفیاء کے نزدیک حالِ خوف اور حالِ رجا سالک کے لئے دو بازوؤں کا حکم رکھتے ہیں۔ جس کے ذریعے وہ خدا کے قرب میں پرواز کرتا ہے۔۔۔۔۔خوف کے بھی تین مدارج ہیں۔۔۔۔۔ پہلا درجہ عام خوف کا ہے جو صرف سطوت اور عظمتِ خداوندی سے پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔۔دوسرا درجہ معتدل خوف کا ہے۔۔۔۔۔یہ سالک کو معاصی سے باز رکھ کر اطاعتِ باری تعالیٰ کی ترغیب دیتا ہے اور تیسرا درجہ قوی خوف کا ہے جو مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ یہ سالک کے لئے یاس و ناامیدی کا باعث ہوتا ہے۔ یہاں ایک نقطہ پیدا ہوتا ہے کہ سالک کے سامنے تین راستے ہیں جن میں سے ایک کا انتخاب اسے ہر حال میں کرنا ہوتا ہے اور ایک حقیقی اور سچا سالک ہمیشہ وہی راستہ اختیار کرتا ہے جس میں اس کے مقصد اور منزل تک پہنچنے میں اسے مدد مل سکے۔ اقبالؒ اس مقام پر سالک سے سوال کرتے ہیں کہ اب یہ تیرا انتخاب ہی بتائے گا کہ تو محض پانی کا قطرہ ہی ہے یا گوہر آبدار۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

اے کہ می خواہی ز دشمن جاں بری
از تو پرسم قطرہ ای یا گوہری

خوف کے بارے میں حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں "......کم بختی ہے اس شخص کی جو دارالغرور (دُنیا) میں مطمئن ہے......اور یہاں کی خوشی پر فریفتہ ہے۔ وحشتِ قبر اور شدتِ یومِ قیامت کو بھول گیا......باطل میں ڈوب گیا ہے......اور کتاب (قرآنِ پاک) سے اعراض کر رہا ہے"۔ مطلب یہ کہ قبر کی وحشت اور عذاب نیز یومِ قیامت کی شدت کو ہمہ وقت یاد رکھنا چاہیئے۔ یہ لازم ہے کہ اللہ رب العزت کا خوف ہر وقت ہونا چاہیئے لیکن بغیر حق تعالیٰ کی ذات کے خوف کے، کسی اور کا خوف شرک ہے......خوفِ غیر شرک اور خوفِ حق ایمان کا عنوان ہے......اقبالؒ اسی بات کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس

خوفِ غیر شرکِ پنہان است و بس

علامہ اقبالؒ خوفِ غیر سے مکمل نجات حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں تا کہ مردِ مومن چٹان کی طرح مضبوط اور الماس کی طرح چمکتا ہوا نظر آئے۔ اس میں زمانے کی مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت ہو اور وہ چاہتے ہیں کہ سالک میں ناتوانی، ناکسی اور ناپختگی کا شائبہ تک نہ ہو کیونکہ یہ علامات آبروئے زندگی کے خلاف ہیں اور کمزور ایمان کی نشانی ہیں۔ فرماتے ہیں:

فارغ از خوف و غم و وسواس باش

پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش

میشوو از وے دو عالم مستنیر

ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

در صلابت آبروئے زندگی ست

ناتوانی، ناکسی، ناپختگی ست

خوف کے برعکس رجا کے معنی لغت میں اُمید، آس اور اصطلاحِ تصوف میں محبوب شئے

کے حصول کی اُمید اور اُمنگ کا نام ہے۔ جو شخص اس محبوب شئے کا انتظار کرتا ہے وہی صاحب رجا ہے۔ اور رجا کے تین مدارج بتائے گئے ہیں ----- پہلا درجہ ثواب میں رجا اور دوسرا درجہ رحمتِ خداوندی میں رجا ہے ----- اور یہ دونوں درجے ایک فرمانبردار بندے کی شان میں صادق آتے ہیں ----- اور تیسرا درجہ ذاتِ خداوندی میں رجا ہے ----- اس درجہ میں بندہ خدا سے اُس کے علاوہ اور کسی شئے کو طلب نہیں کرتا ----- شیخ سعدیؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

خلاف طریقت بود کاولیا
تمنا کنند از خدا جز خدا

صراطِ مستقیم دراصل خوف اور رجا کے بین بین ہے۔ رجا خوف کے ساتھ مل کر بندے کو جادۂ اعتدال پر لاتی ہے۔ خوفِ الٰہی معرفتِ الٰہی کا نتیجہ ہوتا ہے ----- خدا کو جو جس قدر پہچانتا ہے اس پر اسی قدر خوف طاری ہوتا ہے۔ اقبالؒ خوفِ الٰہی کو ایمان کا جزو لاینفک قرار دیتے ہیں ----- لیکن وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو خوفِ الٰہی طاری کر لیتا ہے یا جس پر خوفِ الٰہی کا پرتو ہوتا ہے وہ غیر اللہ کے خوف سے بالکل بے نیاز اور آزاد ہو جاتا ہے۔ خوفِ غیر شرک ہے اور خوفِ حق ایمان کا عنوان ہے ----- فرماتے ہیں:

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس
خوفِ غیر شرکِ پنہان است و بس
بندہ حق پیش مولیٰ "لا" اتی
پیش باطل از "نعم" بر جاتی

شیطانی قوتوں کا ایک حربہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں خوف و حزن پیدا کر کے اسے راہِ حق یا صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتی ہیں ----- اسے گمراہی کی جانب راغب اور مائل کرتی ہیں ----- اور اہلِ حق کسی خوف یا دوسرے کو دل میں نہیں لاتے ----- انہیں سوائے حق تعالیٰ کے خوف کے کسی قسم کا خوف یا

ڈر نہیں ہوتا ..... وہ اپنے ایمان کی استقامت اور یقین کے بل بوتے پر مسلسل قرآنِ پاک کی اس آیت مبارکہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں:

"انما ذٰلکم الشیطٰن یخوف اولیاء من فلا تخافو ھم و خافون ان کنتم مؤمنین."

(ترجمہ): "جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا تھا یا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ شیطان تھا، ان سے مت ڈرو، اور مجھ (اللہ تعالیٰ) سے ڈرو اگر تم ایمان لائے ہو"۔

علامہ اقبالؒ اسی آیت کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی یوں تفسیر بیان کرتے ہیں:

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروان زندگی را رہزن است
تخم او در کلت خود را نکاند
زندگی از خود نمائی باز ماند
ہر کہ رمز مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے مقابلہ میں گئے اور جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو ارشادِ باری تعالیٰ ہوا کہ خوف مت کھاؤ:

"قلنا لا تخف انک انت الاعلیٰ......"

ترجمہ "ہم نے کہا اندیشہ نہ کر تو ہی غالب رہے گا"

علامہ اقبالؒ نے اسی عالمگیر سچائی کو یوں بیان فرمایا ہے:

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلب او از لاتخف محکم شود

صبح ہجرت جب نبی اکرم ﷺ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ غار میں موجود تھے۔۔۔۔۔اور دشمن قریب آ گیا تو رفیقِ غار کو پریشانی لاحق ہوئی کہ کہیں حضور ﷺ کو ایذا نہ پہنچے۔۔۔۔۔تو رسالت مآب ﷺ نے پورے یقین کے ساتھ فرمایا "لاتحزن ان اللہ معنا" ۔۔۔۔۔(ترجمہ: غم مت کھاؤ، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے)۔اس واقعے سے اس بات کی تائید و توثیق ہوتی ہے کہ سخت مشکل مرحلے پر بھی خدا تعالیٰ کی معیت و مدد سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔۔اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین اور بھروسہ ہے تو کسی قسم کا خوف دل میں پھٹکنا بھی نہیں چاہیے۔۔۔۔۔علامہ اقبالؒ اِسی واقعہ کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

اے کہ در زنداں غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر
ایں سبق صدیقؓ را صدیق کرد
سر خوش از پیمانہ تحقیق کرد
کز خدا داری ز غم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو

علامہ اقبالؒ "لاالہ" کے نعرۂ مستانہ سے ایک ایسا پیکرِ انسانی ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں کہ جسے ماسوائے اللہ رب العزت کے کوئی معبود نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔باقی سب الٰہ اس کی نظر میں ہیچ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔اور پھر اسی یقینِ محکم کی بدولت وہ ہر غم سے بے نیاز اور ہر غم سے آزاد ہو جاتا ہے۔اسی "لاالہ" کے عصا کی قوت سے وہ ہر قسم کے جادو اور سحر کا توڑ کرتا ہے اور کسی قسم کا جادو اور سحر اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔مطلب یہ کہ مومن جب ایک خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جائے تو اسے کسی اور کا خوف نہیں ہوتا۔

اقبالؒ فرماتے ہیں:

خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ خوفِ جہاں
خوفِ آلامِ زمین و آسمان
حبِ مال و دولت و حبِ وطن
حبِ خویش و اقرباء و حبِ زن
تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہرکہ حق باشد چوں جاں اندر تنش
خم نگردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینہ او راہ نیست
خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

علامہ اقبالؒ سالکِ صادق کو راہِ حق سے بھٹکنے سے روکنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور قرآنِ پاک کی آیتِ کریمہ "لاتقنطوا من الرحمته الله ۰"(ترجمہ: اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو) کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں فرماتے ہیں:

ای مسلماں جز براہِ حق مرو
نا امید از رحمتِ عامی مشو

علامہ اقبالؒ حیاتِ انسانی کے استحکام کے لئے مندرجہ ذیل اشعار میں اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ قرآنِ پاک کی تعلیمِ مذکورہ (یعنی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو) پر مکمل یقین و عمل لازمی اور ناگزیر امر ہے..... ناامیدی اور یاسیت حیاتِ انسانی کے لئے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے ہر حال میں ایک سالک کو بچنا چاہیئے فرماتے ہیں:

مرگ را سامان ز قطع آرزو ست
زندگانی محکم از لاتقنطوا ست
نا امید از آرزوئی پیہم است
نا امیدی زندگانی را سم است

رجا یعنی اُمید راہِ مصطفیٰؐ ہے اس پر ہر مسلمان کو چلنا چاہیئے ------ علامہ اقبالؒ یاس یا نا امیدی کو زہرِ قاتل سمجھتے ہیں اور رجا یعنی راہِ مصطفیٰ ﷺ سے گریز کو کافری سے تعبیر کرتے ہیں ----- ان کے نزدیک نا امیدی کفر ہے اور بس ----- لہٰذا فرماتے ہیں:

کشودم پردہ را از روئے تقدیر
مشو نو مید و راہِ مصطفیٰؐ گیر
اگر باور نداری آنچہ گفتم
ز دین بگریز، مرگ کافری مرا

اقبالؒ کے نزدیک یاس و نا امیدی سے علم و عرفان میں ضعف و زوال آتا ہے لہٰذا اس سے پرہیز کرنا چاہیئے ----- اور مومن صادق کبھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفان ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

باب نہم

علامہ اقبالؒ اور نظریۂ عقل و عشق

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اقبالؒ نے لفظ "عشق" کو نہایت ہی وسیع ترمعنوں میں لیا ہے۔ یہ مجاز اور حقیقت، دونوں پر حاوی اور خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک عشق ایک ایسا جوہر ہے جو "جوش وجدان" کا جذبہ جاگر کرتا ہے اور جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ اس کی بدولت انسان تکمیلِ ذات کے لئے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا ہے اور ہر قسم کے موانع پر قابو پاتا ہے۔ یہ ایک وجدانی کیفیت کا نام ہے۔ جس کا خاصہ مستی، انہماک اور جذبِ قلبی ہے۔ اس سے انسانی ذہن زمان و مکان پر اپنی گرفت مضبوط کرتا اور لزوم و جبر کی زنجیروں سے چھٹکارا پاتا ہے۔ عشق کا ایک اور خاصہ پیہم آرزو ہے۔ اقبالؒ کا تصورِ عشق دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔

عشق کا بنیادی ماخذ قرآنِ پاک اور حدیثِ نبوی ﷺ ہے۔ لیکن قرآن و حدیث میں اس کا نام عشق نہیں بلکہ محبت ہے۔ مثلاً:

"والذین آمنوا اشد حبا الله" ...... (ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے ساتھ شدید محبت رکھتے ہیں) اور ...... "ثلث من کن فیہ وجد هن حلاوۃ الایمان من کان اللہ و رسولہ حب الیہ مما سواهما ○ ومن احب عبداً لایحب الاالله ومن یکرہ ان یعود فی الکفر بعد ان قذہ اللہ منہ کما یکرہ ان یلقی فی النار" ......(ترجمہ: تین چیزیں جس کے اندر ہوں وہ ان کے ذریعے ایمان کا مزہ پائے گا۔ جس شخص کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) ان کے

ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں اور جس شخص نے کسی بندے سے محبت کی نہیں محبت کی مگر اللہ کے لئے اور جو شخص کفر کی طرف لوٹ جانے کو مکروہ سمجھتا ہے بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس (کفر) سے رہائی دی جیسا کہ دوزخ میں ڈالے جانے کو مکروہ سمجھتا ہے۔)

بلاشبہ علامہ اقبالؒ کا تصورِ عشق قرآن وحدیث میں بیان کی گئی محبت سے ماخوذ ہے لیکن اس کی انتہائی صورت یعنی "عشق" کو اقبالؒ نے اپنے مرشد معنوی مولانا رومیؒ سے بھی اخذ کیا ہے۔ اسرار و رموز میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:

گفت دیوانہ ء اسباب عشق
جرعہ ء گیر از شراب ناب عشق

ارمغانِ حجاز میں بھی اقبالؒ نے عشق کی اس انتہائی لذت سے آشنائی کا سہرا مولانا رومیؒ کے سر باندھا ہے فرماتے ہیں:

گرہ از کار این ناکار وا کرد
غبارِ رہگذر را کیمیا کرد
می آن نی نوازی پاک بازی
مرا با عشق و مستی آشنا کرد

علامہ اقبالؒ نے عشق کا تصور اگرچہ مولانا رومیؒ سے اخذ کیا اور اس سلسلے میں مولانا رومیؒ کی مثنوی اقبالؒ کے پیشِ نظر رہی لیکن عشق ومحبت کا یہ تصور جو کلامِ اقبالؒ میں نظر آتا ہے اس پر قدیم صوفی شعراء کی تعلیمات اور تصوف کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کا بھی اثر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز جو اقبالؒ کی تعلیمات میں ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبالؒ نے صوفیائے کرام کی تعلیمات اور کتب سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا اسے اس نظریہ میں شامل کرکے گویا اسلامی تعلیمات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ مثلاً اقبالؒ نے تصورِ عشق مولانا رومیؒ سے اخذ کیا لیکن رومیؒ وحدت الوجود کے قائل ہیں اور اقبالؒ جہاں بھی

عشق پر وحدت الوجود کا رنگ دیکھتے ہیں وہاں اپنے پیر و مرشد کا ساتھ نہیں دیتے اور اپنے تصورِ خودی کی حفاظت اور استحکام کے بارے میں یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کر ہے فراق

وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

عشق زندگی کا زبردست محرکِ عمل ہے۔ احوالِ سالک میں محبت تیسرا حال ہے اور عشق اس کی شدید ترین صورت ہے۔ محبت جب درجہ کمال کو پہنچتی ہے تو اسے عشق کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اپنے کلام میں عشق و محبت کی تشریح و توضیح میں اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور دونوں کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق

سبب یہ ہے کہ محبت کبھی زمانہ ساز نہیں

اصطلاحِ تصوف میں سالک کے دل میں حسنِ ازل سے پیدا ہونے والی کشش کا نام محبت (عشق) ہے۔ محبت کے بھی تین مدارج ہیں۔ پہلا درجہ: عام لوگوں کی محبت جو خدا کے احسان سے ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا درجہ: صادقین کی محبت جو خدائے تعالیٰ کی بے نیازی، جلال و عظمت اور علم و قدرت کو دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور تیسرا درجہ: اعلیٰ قسم کی وہ محبت ہے جو صدیقین و عارفین کی محبت ہے جو ان کے کمالِ معرفت کا نتیجہ ہوتی ہے وہ کسی علت و سبب کے بغیر اللہ کو دوست رکھتے ہیں۔ اسی محبت کو اقبالؒ نے اپنے نظریہ عشق کی بنیاد بنایا ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ فرماتے ہیں "...... حق تعالیٰ کی محبت کے علاوہ دوسری اشیاء کی محبت میں گرفتار ہو جانا امراضِ قلب میں سے شدید ترین مرض ہے...... اس کے ازالہ کی فکر کرنا سب ضروری باتوں سے زیادہ ضروری ہے۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک انسانی حیات کا لائحہ عمل یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے محبوبِ حقیقی سے محبت کرے...... چنانچہ ڈاکٹر محمد عباس علی تحسؔ کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"انسان صرف جویائے محبت اور اپنے پیارِ حقیقی کے ڈھن میں لگا رہے۔ باقی تمام عبث اور خیالی دُنیا کا بیہودہ فلسفہ ہے۔ ہم اس کو ڈھونڈیں اور اتنا ڈھونڈیں کہ اپنے آپ کو پائیں"۔

زبورِ عجم میں ایک شعر کے اندر اقبالؒ نے اس بات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے:

عشق شور انگیز را پر جادہ در کوئے تو برد

بہ تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

اقبال عشق سے فطرت کی تسخیر کا کام لیتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے دل کو کائنات سے متحد کرتے ہیں۔ اسی جذبے کی بدولت انسان کی نظر اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہمتِ مردانہ کے سامنے جبریل کو صیدِ زبوں سمجھنے لگتا ہے اور اپنے وجدان کی کمند سے ذاتِ یزداں پر قابو پانے کے منصوبے سوچتا ہے:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

جذبہ عشق مجاز کی منزلوں سے گزرتا ہوا جب شاہدِ حقیقی سے ہمکنار ہوتا ہے تو عقل اپنے گلے میں طوقِ غلامی ڈال لیتی ہے۔ قافلہ حیات کی ساری ہماہمی اور ہنگامہ خیزی عشق ہی کی بدولت ہے:

من بندہ آزادم، عشق است امامِ من

عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من

ہنگامہ ایں محفل از گردشِ جامِ من

ایں کوکبِ شامِ من، ایں ماہِ تمامِ من

جاں در عدم آسودہ بے ذوقِ تمنا بود

مستانہ نواہا زد در حلقہ دامِ من

اقبالؒ نے عشق کے موضوع پر بہت کچھ لکھا۔ یہ مضمون انہیں بے حد عزیز ہے کیونکہ عشق ہی سے ساری کائنات کی رونق ہے اور حیات انسانی کی ساری ہنگامہ آرائیاں اسی جذبہ کی رہینِ منت ہیں۔ کائنات کی سب رعنائیاں اور برگِ لالہ کی رنگ آمیزی عشق ہی کی بدولت ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

بہ برگِ لالہ رنگ آمیزی عشق
بجانِ ما بلا انگیزی عشق
اگر ایں خاکداں را واشگافی
درونش بنگری خوں ریزی عشق

عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد ہے۔ اس کے جذب وتمنا کی سعی وجد خارجی اضطراب سے مقاومت کرتی ہوئی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ انسان کی اندرونی قلبی حیات میں جب اس جذبے کا اثر ہوتا ہے تو پھر وہ محض مٹی کی مورت نہیں رہتا بلکہ وہ ایک قوت اور طاقت بن جاتا ہے۔ زندگی کے زیرو بم کا انحصار بھی اسی جذبے کی بدولت ہے:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز و الم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

خواجہ حافظ شیرازیؒ نے، جو اپنے وقت کی ایک بڑی صاحب معرفت شخصیت تھے، اسی خیال کو اپنے ان اشعار میں پیش کیا ہے:

عشقت نہ سر سریست کہ از سر بدر شود
مہرت نہ عارضیست کی جائی دگر شود

عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم

باشیر در درون شد و با جان بدر شود

عشق ہی سے زندگی کے امکانات اجاگر ہوتے ہیں اور اس کی محدودیت بیکرانی میں بدلتی ہے۔ اقبالؒ کو اس کے دریائے بیکراں بننے پر ناز ہے:

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو

یہ میری خودنگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

اسی بات کو خواجہ حافظؒ کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں:

دردیست درد عشق کہ اندر علاج او

ہر چند سعی پیش نمائی بتر شود

ماہرینِ اقبالیات ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اقبالؒ نے عشقِ حقیقی کی تفسیر و تشریح کرتے وقت اس کی تمام تر جزئیات اور اسباب و علل کو مدِنظر رکھا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک عشق اصلِ حیات ہے۔ یہ طوفان کے آگے ایک بند ہے اور عصرِ رواں کے علاوہ گردشِ زمانہ کے ماضی و حال اور مستقبل کی جھلک اسی جذبے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور یہ ساری کائنات کی کارسازی محض عشق ہی کی بدولت ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ عشق کی کرشمہ سازی ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ

عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو

عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عشق اقبالؒ کے نزدیک اس قدر اہم ہے کہ اسلام کی تکمیل کا انحصار اسی پر ہے۔ کافر اگر صاحبِ عشق ہے تو اس کا کفر بھی اسلام کا درجہ رکھتا ہے اور اگر مسلمان کا دل جذبۂ عشق (حقیقی) سے لبریز نہیں تو اس کا اسلام بھی کفر کے مترادف ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا:

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

عشق کے بغیر دین و شریعت، کہ جس میں عقل و نگاہ کا عنصر بھی شامل ہے، بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عشق کے مقابلے میں عقل ناقص ہے۔ عقل اگرچہ "ذوقِ نگاہ" سے بیگانہ نہیں ہے لیکن اس میں جراتِ رندانہ کی کمی ہے جو عشق میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں:

چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست

لیکن او را جرأتِ رندانہ نیست

حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ عشقِ حقیقی اور ایمانِ محکم کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں اور ان سالکوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں جو ایمانِ کامل کی آرزو تو کرتے ہیں لیکن کامل عشق کا اظہار نہیں کر پاتے اور ایمان کی حدود و قیود سے آزاد مقام (عشق) تک رسائی کو محال جانتے ہیں۔ حضرت سلطان باہوؒ عشق کے اثبات کو ضروری سمجھتے ہیں برخلاف اس کے کہ ایمان ہو اور سالک کو شوق کے جذبے کا اظہار کا طریقہ ہی نہ آتا ہو فرماتے ہیں:

ایمان سلامت ہر کوئی منگے، عشق سلامت کوئی ہو

منگن ایمان، شرماون عشقوں، دل نوں غیرت ہوئی ہو

جس منزل نوں عشق پچاوے ایمان نوں خبر نہ کوئی ہو

میرا عشق سلامت رکھیں باہوؒ، ایمانوں دیاں دھروئی ہو

اقبال بھی اسی عشق کے حامی ہیں۔ اقبال عشق کو حاصلِ زندگی کہتے ہیں۔ عشق کو دین اور دین کو عشق کہتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک انسان کے تمام علوم، ساری دانش اور پورے معاملاتِ زندگی کی اساس عشق پر منحصر ہے۔ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں:

زندگی را شرع و آئین است عشق

اصلِ تہذیب است دین، دین است عشق

ظاہر او سوز ناک و آتشین

باطن او نورِ رب العالمین

از تب و تابِ درونش علم و فن

از جنون ذو فنونش علم و فن

دیں مگرود پختہ بے آداب عشق
دیں بگیر از حجت اسباب عشق

عشق سے اقبال کا مقصود محبتِ الٰہی ہے اور وہ محبتِ الٰہی کے لئے محبت اور اتباع رسول کریم ﷺ کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ مومن اور عشق کے باہمی امتزاج کو ہی زندگی کی معراج قرار دیتے ہیں۔ اگر عشق کا جذبہ پیدا نہیں تو مومن کامل نہیں:

مومن از عشق است و عشق مومن است
مومن را ناممکن، عشق را ممکن است
عشق صید از زور بازو افگند
عشق مکار است و دامے می زند

علامہ اقبال عقل و عشق کا موازنہ کرتے ہوئے عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں۔ عقل جس مرحلے پر علل و اسباب میں سرگرداں رہتی ہے عشق وہاں ایک ہی جست میں مرحلہ شوق کو طے کر لیتا ہے۔ عقل شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے جبکہ عشق اپنے عزم و یقین کی بدولت حقیقت کی جانب محو سفر رہتا ہے۔ اسرار ورموز میں فرماتے ہیں:

عقل سفاک است و سفاک تر
پاک تر، چالاک تر، بیباک تر
عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگان باز میدان عمل
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقین لاینفک است

آں کند تعمیر تا ویراں کند

ایں کند ویران کہ آباد آں کند

اقبالؒ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عشق سے وہ کام کیا جاسکتا ہے جو عقل سے ممکن نہیں۔ عشق کے نزدیک ماہ وسال، دور ونزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کی قوت کا اندازہ مشکل ہے۔ وہ کوہ کو کاہ کے برابر اور بادو خاک وآب کو بے معنی سمجھتا ہے اور کسی بھی خارجی رکاوٹ یا دشواری کو سدِ راہ نہیں مانتا۔ اعصابی تختی اس کے سامنے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور عقل بیم ورجا کی کشمکش میں گرفتار رہتی ہے۔ عشق آزاد ہے اور عقل حدود وقیود کے تابع ہوتی ہے۔ عقل جلالِ کائنات سے ترساں ولرزاں ہے اور عشق جمالِ کائنات میں مستغرق رہتا ہے۔ عقل رفتہ وحاضر پر نظر رکھنے پر مجبور ہے جبکہ عشق مستقبل میں جھانکنے کی ترغیب دیتا ہے۔ عقل کو اقبالؒ مجبورِ محض سمجھتے ہیں جو کہ کسی بھی معاملے پر غور کرنے کی ضرورت کو اہمیت دیتی ہے اور عشق اس کے مقابلے میں منزل کی جانب رواں دواں رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ عشق کچھ کر گزرنے کی دعوت دیتا ہے اور قوت وہمت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جبکہ عقل سوچنے اور مزید سوچنے کی متمنی ہوتی ہے۔ لہٰذا اقبالؒ جس مرحلے پر عقل کو ناکام دیکھتے ہیں وہیں سے عشق کی کامیابی کی دلیل پیش کردیتے ہیں اور اسی جذبے کی کارفرمائی گردانتے ہیں کہ عقل کو مجبور پاکر جب کوئی کامیابی حاصل کرلی جائے تو وہ عقل کے طفیل نہیں بلکہ لگن اور جنون یا ذوق وشوق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جاوید نامہ کے یہ اشعار دیکھیں جن میں اقبالؒ نے عقل اور عشق کا موازنہ کیا ہے:

می نداند عشق سال و ماہ را

دیر و زود و نزد و دور راہ را

عقل در کوہی شگافی میکند

یا بگرد او طوافی میکند

کوہ پیش عقل چوں کاہی بود

دل سریع السیر چوں ماہی بود

عشق شبخوابی زدن بر لا مکان

گور را نا دیدہ رفتن از جہان!

زور عشق از باد و خاک و آب نیست

قوتش از سختی اعصاب نیست

اقبال عشق کو عقل کے مقابلے میں اس لئے فضیلت دیتے ہیں کہ اس سے حقائق اشیاء کا مکمل علم اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ انسانی زندگی میں جتنا اس جذبے کا اثر ہے عقل کا اثر اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ زندگی کا ہنگامہ اسی جذبے کی بدولت ہے۔ اگر دل بھی عقل کی طرح فرزانہ ہوتا تو جینے کا لطف باقی نہ رہتا۔

تہی از ہائے و ھوے خانہ بودے

گل ما از شرر بیگانہ بودے

نبودے عشق و ایں ہنگمہ عشق

اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

لیکن یہ سمجھنا کہ اقبال عقل کے مخالف ہیں قطعی غلط اور نا مناسب ہوگا۔ اقبال عقل کو بھی زندگی کے خادموں میں شمار کرتے ہیں۔ زندگی پر اس کے بہت سے احسانات ہیں لیکن عقل سب کچھ بھی نہیں۔ اس پر حد سے زیادہ تکیہ کرنا بھی مناسب نہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرأتِ رندانہ کی کمی ہے یعنی بجائے خود وہ تخلیق کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے عشق کے وجدان اور پشت پناہی کی طلبگار ہے۔ وہ خود آگے قدم بڑھانے میں ہچکچاتی ہے۔ جہاں وہ پس و پیش اور حیص بیص کا شکار ہوتی ہے اس مرحلے پر عشق قافلہ سالاری اور رہبری کا کام

سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ تمام اہم امور جن سے قوموں کی تقدیر بدل گئی کسی نہ کسی جذبے کے تحت انجام پائے۔ اسی خیال کو اقبالؒ یوں پیش کرتے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عقل حیلے حوالے سے منزل طے کرتی ہے اور عشق میں خود اتنی کشش ہے کہ وہ کشاں کشاں قافلہ حیات کو منزل کی جانب تیز گام لے جائے۔ اس خیال کو اقبالؒ نے کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے:

ہر دو بمنزلے رواں، ہر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

الغرض اقبال عشق کو دل و نگاہ کا مرشد اولین قرار دیتے ہیں اور اس کے نہ ہونے سے شرع و دین کو محض ایک تصوراتی بتکدہ قرار دیتے ہیں:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

☆☆